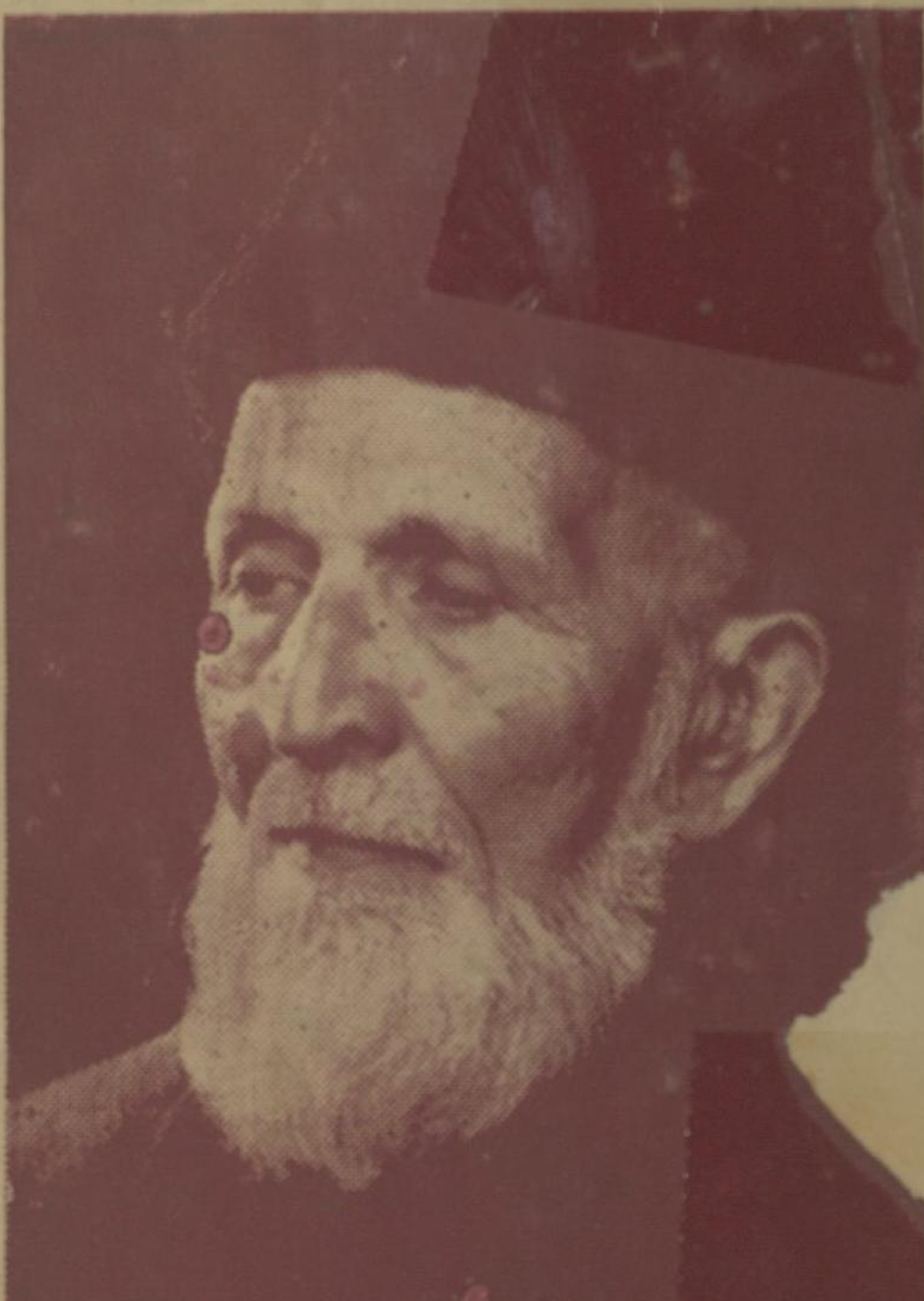
علامہ حیرت بدایونی

حیات اور ادبی خدمات



رشید الدین

علامہ حیرت بدایونی

حیات اور ادبی خدمات

از

رشید الدین

[ناشر]

ادبی مرکز، چھتہ بازار، حیدرآباد

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
سن اشاعت : ۱۹۷۹ء
قیمت : دس روپے
تعداد اشاعت : ایک ہزار
کتابت : منظور علی خاں، ایم۔ اے۔ مجید
بہ اعانت : آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی۔ حیدرآباد

دیگر ملنے کے پتے :

شہناز رشید، ۱۱۱-۲-۱۲- مراد نگر
حیدرآباد (۲۸) آندھرا پردیش

آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی بک ڈپو
اے۔ سی گارڈ۔ حیدرآباد

اپنے بڑے بھائی

قاضی محمد کلیم الدین (مرحوم)

سابق اسسٹنٹ لیبر کمشنر، حکومت مہاراشٹر

کے نام ————

جنہوں نے مجھے تعلیم کے زیور سے آراستہ
کر کے شعور کی دولت عطا کی

———— رشید

فہرست

۲ ادبی خدمات

پیش لفظ

حیدرآباد کی علمی اور ادبی فضاء میں علامہ حیرت بدایونی (مرحوم) کی شخصیت کوئی نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک اپنی زبان و بیان کا جادو جگاتی رہی۔ وہ ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد آئے اور ایسے آئے کہ یہیں کے ہو رہے ان کی مرنجان مرنج شخصیت اور باغ و بہار طبیعت نے ہر ایک کا دل موہ لیا اور طبقہ خواص سے لے کر عوام تک وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ ان کا انتقال ۱۵ فروری ۱۹۷۵ء کو ہوا۔ اپنے انتقال سے قبل وہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان و پاکستان میں ایک بزرگ شخصیت کے طور پر مشہور ہو چکے تھے اور سارے برصغیر میں مشاعرے پڑھ چکے تھے۔

لیکن اس کے باوجود ان پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ نام و نمود کے کبھی خواہشمند نہیں رہے۔ انہوں نے اپنا مجموعہ کلام "آئینہ" بھی اپنے دوستوں کے اصرار پر آخری دنوں میں چھپوایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا کلام "آئینہ" سے بہت زیادہ ہے۔ علامہ مرحوم نے شعر و ادب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے لیکن خود ان کی شخصیت کے نقوش ادب کے طالب علموں کے لئے بے حد دھندلے تھے۔ اس کتاب کا مقصد یہی ہے کہ نہ صرف ان نقوش کو واضح کر کے محفوظ کر دیا جائے بلکہ ان کے تمام کاموں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ جو صرف شاعری اور غزل گوئی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اس میں صحافت سے لے کر نثر نگاری تک سب کچھ شامل ہے

یہ کتاب اصل میں ایک تحقیقی مقالہ ہے جو میں نے ۱۹۷۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم اے (اردو) کے امتحان کی تکمیل کے لئے لکھا تھا اور اسی سال اسی پر مجھے ایم اے کی سند ملی تھی۔ اس سے ایک سال قبل ہی علامہ کا انتقال ہوا تھا اور ان کے خاندان سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کی موت میرے لئے بھی ایک شخصی سانحہ بن گئی تھی اس لئے جب ایم اے (فائنل) میں مقالہ لکھنے کا سوال آیا تو میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا اور خوش قسمتی سے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بھی مجھے اس کی اجازت مل گئی۔

لیکن جب میں نے علامہ پر واقعی مواد اکٹھا کرنا شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس راہ میں بے شمار دشواریاں حائل ہیں علامہ نے کبھی اپنی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ چیزیں سنبھال کر نہیں رکھیں اور نہ ان کے کسی فرزند نے یہ کام انجام دیا۔ ویسے ان کا سارا گھرانا پڑھا لکھا اور باشعور ہے لیکن علامہ کے صدر خاندان ہونے کا ان پر کچھ ایسا رعب یا اثر تھا کہ وہ علامہ کے لکھنے پڑھنے اور شاعری کے معاملہ میں کم ہی دخل دیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد علامہ کا ذکر ان سب کی کمزوری بن گیا جس سے میری دقتوں میں مزید اضافہ ہو گیا ان کے انتقال سے کوئی پندرہ سال قبل سے میں بھی ان کے ربط میں آچکا تھا لیکن ان کی شخصیت مجھے اتنی بلند اور عظیم معلوم ہوتی تھی کہ ان کی زندگی یا فکر و فن کے بارے میں کچھ لکھنے کے تعلق سے میں نے کبھی نہیں سوچا۔ حالانکہ اس عرصے میں حیدرآباد اور اس سے باہر کی متعدد علمی اور ادبی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کے بارے میں مختلف رسائل میں میرے بے شمار مضامین شائع ہو چکے تھے ــــ اس مقالے کی تیاری میں میں نے علامہ مرحوم کی

مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام تحریریں دیکھیں۔ جیلبنوں لائبریریوں کی خاک چھانی اور پرانی کتابوں کے تاجروں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ علامہ کے جاننے والوں اور ان کے احباب سے بھی ملا۔ اور ان سے زبانی استفسار کے علاوہ تحریری سوالنامے بھی انہیں دیئے۔ ان تمام احباب کی فہرست میں نے ضمیمہ میں شخصیات کے تحت دے دی ہے۔ ان تمام احباب اور خاص طور پر علامہ کے تیسرے فرزند احمد جلیس اور دوسری صاحبزادی محترمہ جیلانی بانو سے مجھے اس مقالے کی تیاری میں بہت مدد ملی جس کے لئے میں ان تمام کا شکرگزار ہوں۔

میں نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ حالات زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ ادبی خدمات اور ان کے کارناموں پر جس میں ان کی نثر نگاری، صحافت اور شاعری شامل ہے۔ علامہ کو عام طور پر لوگ شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے اور نثر میں ان کی کئی مطبوعہ تصانیف اور مضامین موجود ہیں۔ ان کی نثر کی ایک کتاب "امیر خسرو کی فارسی شاعری" ان کے انتقال کی وجہ سے نامکمل رہ گئی۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی اور جیتی جاگتی یادگار جیلانی بانو ہیں۔ جو آج ہند و پاک کی ایک ممتاز ادیبہ ہیں۔ علامہ نے صحافت کے کوچہ کی بھی گشت کی۔ اخباروں میں مزاحیہ کالم بھی لکھے۔ اور رسائل کی ایڈیٹری بھی کی۔ ان کی شاعری میں صرف غزل گوئی ہی شامل نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ غزل گوئی کے لئے انہوں نے قدیم طرز کو اپنایا تھا اور ان کا موضوع عشق تھا جو یقیناً ایک پامال موضوع ہے۔ لیکن اسمیں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت کی چھاپ چھوڑی ہے۔ آخر میں مجھے اپنے نوجوان استاد

ڈاکٹر یوسف سرمست کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی نگرانی میں یہ کتاب ایک مقالے کے طور پر ترتیب پائی۔ اگر قدم قدم پر مجھے ان کی رہنمائی اور ایک استاد سے زیادہ دوست کی رفاقت حاصل نہ ہوتی تو شائد یہ کام میرے لئے بہت مشکل ہوتا۔ انہوں نے مجھ سے اس مقالے میں محنت بھی کافی کرائی۔ وہ ہر وقت ایم کی سطح پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے معیار کو پیش نظر رکھتے تھے اور مجھ سے اکثر کہا کرتے کہ "رشید صاحب! آپ کا شمار عام طلباء میں نہیں ہو سکتا۔ آپ کو امتحانی نقطہ نظر سے ایک مقالہ لکھنا نہیں ہے بلکہ علامہ پر مستقل تصنیف کرنی ہے"۔

اس پس منظر میں میں نے یہ مقالہ لکھا تھا اور یہ سمجھ کر لکھا تھا کہ اسے جلد یا بدیر کتابی صورت میں شائع ہونا ہے اور یہ اردو ادب میں علامہ حیرت بدایونی پر پہلی حوالے کی کتاب ہوگی۔ اسے بہت قبل شائع ہونا چاہئے تھا۔ لیکن کچھ تو میری مصروفیات اور کچھ اردو میں پبلشروں کی عدم دستیابی اس کی جلد اشاعت میں حائل رہی۔

میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کا شکر گزار ہوں جس کی اعانت سے اس کی اب بھی اشاعت کی سبیل ہو سکی۔

رشید الدین

مددگار مترجم (اردو) نظامت ترجمہ

حمایت نگر حیدرآباد۔ ۲۹ اے پی

۲۶ اپریل ۱۹۷۹ء

مُقدّمہ

حیدرآباد میں علامہ حیرت بدایونی کی ذات بجائے خود ایک بھری پری انجمن اور ایک تہذیبی ادارہ تھی۔ وہ اس شہر ہی کے نہیں بلکہ ساری اردو تہذیب کی درمیانی صدی کے قیمتی ورثے کے امین تھے۔ علمی، ادبی انجمنوں میں ان کی موجودگی سے ایک رونق سی آجاتی تھی وہ ہماری ایسی خوشگوار عادت بن گئے تھے جس کا ترک کرنا اپنی شناخت کھو دینے کے مترادف تھا۔ مشاعروں اور جلسوں میں نگاہیں آج بھی ان کو ڈھونڈتی ہیں۔ ملے پلی کی "حیرت بدایونی روڈ" سے گذرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہیں نہ کہیں ان سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ وہ آنکھوں کے اوپر ہاتھ کا آسرا بنا کر چند لمحے بغور دیکھیں گے اور پھر صورت پہچان کر اچانک کھل اٹھیں گے۔ بڑی شفقت کے ساتھ نام لیکر مخاطب کرینگے اور مزاج پرسی کریں گے پھر کچھ دل جوئی کی باتیں کر کے آگے بڑھ جائیں گے۔

ہم لوگ مشاعروں میں ان کا کلام سنتے اور داد دیتے رہے لیکن ان کی شخصیت کے اور پہلو اتنے رنگارنگ اور دلکش تھے کہ کبھی انہیں محض شاعر کی حیثیت سے دیکھنے اور بحیثیت شاعر ان کا مقام جاننے کی طرف توجہ نہیں دی۔ شاعری خود علامہ کے لئے ان کے "دریائے بے تابی" کی ایک "موج خون"

سے زیادہ نہیں تھی۔ "آئینہ" کی اشاعت کے بعد جب ان کے منتخب کلام کو یک جا دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ وہ بلاشبہ پائندۂ سخن میں جگہ پانے کے مستحق تھے۔

علامہ حیرت بدایونی صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ "مجموعہ کلام" کی اشاعت سے کئی برس پہلے ان کی نثری تصانیف منظر عام پر آچکی تھیں انہوں نے بعض اخباروں کے مزاحیہ کالم بھی لکھے ان کالموں میں ان کے مزاح کی شوخی کے ساتھ ان کی سیاسی اور سماجی بصیرت بھی جھلکتی ہے۔ علامہ کو عربی اور فارسی پر پورا عبور حاصل تھا اردو تو ان کے گھر کی پرداختہ تھی۔ مذہبی علوم کے علاوہ بلاغت، بدیع اور عروض پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

ان کا مطالعہ وسیع تھا اور انہوں نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ حافظہ بھی اچھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی گل افشانئ گفتار سے کسی بھی محفل میں جان محفل بن جاتے۔ مزاح کی چاشنی ان کی گفتگو کو اور بھی دلآویز بنا دیتی۔ علامہ کا تعلق اگرچہ قدیم دبستان شاعری سے تھا لیکن وہ جدید ادبی رجحانات اور تحریکات سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ ان کے معتدل رنگ کو پسند بھی کرتے تھے انہوں نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی اس کا اندازہ ماہنامہ "چراغ" کے مشمولات سے ہو سکتا ہے۔ جو ان کی ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا مجھے علامہ سے ذاتی طور پر نیاز حاصل رہا۔ جب میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے فانی بدایونی پر مقالہ لکھ رہا تھا۔ فانی کی حیات کے بارے میں چند استفسارات کے ساتھ علامہ سے رجوع کیا تو انہوں نے ایسی دلچسپی کا اظہار کیا گویا یہ میرا کام نہیں تھا بلکہ ان کا اپنا کام تھا اور پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے مختلف نشستوں میں مطلوبہ معلومات فراہم کیں۔

علامہ ہر ایک سے ایسے ہی خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آتے اور اس کے ذاتی مسائل سے اپنے تعلق خاطر کا اس طرح اظہار کرتے کہ وہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتا۔ علامہ نے آخری زمانے میں اپنے سوانح مرتب کرنے شروع کئے تھے افسوس ہے کہ وہ اسے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ یہ آپ بیتی اگر مکمل ہو جاتی تو خاصے کی چیز ہوتی۔ تحریک خلافت سے لے کر سقوط حیدر آباد تک ملکی اور قومی سیاست نے جو کروٹیں لیں اور گزشتہ نصف صدی میں ادب کی دنیا میں جو معرکے رہے ان کی بعض دلچسپ اور اہم تفصیلات سامنے آتیں۔

علامہ حیرت بدایونی کی شخصیت اور ان کے کارنامے یقیناً اس اہمیت کے حامل تھے کہ ان کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا۔ خوشی کی بات ہے کہ حیدر آباد کے نوجوان ادیب رشید الدین صاحب نے اس طرف توجہ کی۔ وہ اس کام کے لئے یوں بھی زیادہ موزوں اور اہل تھے کہ انہیں علامہ حیرت بدایونی سے طویل عرصے تک قرب حاصل رہا۔ رشید الدین صاحب کو اردو شعر و ادب سے گہرا شغف ہے۔ وہ خود بھی اچھے نثر نگار، نقاد اور مترجم ہیں ان کے تنقیدی اور معلوماتی مضامین اور تراجم موقر ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ پورا انصاف کریں۔ چنانچہ علامہ حیرت بدایونی کے حالات زندگی فراہم کرنے کے سلسلے میں انہوں نے ان تمام اصحاب سے ربط پیدا کیا جن سے کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہونے کی توقع تھی۔ اس کے علاوہ ان کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تحقیق کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہے کہ کبھی تو تائید غیبی کی وجہ سے غیر متوقع طور پر کسی کاوش کے بغیر ہی گراں بہا مواد ہاتھ لگ جاتا ہے اور کبھی پہاڑ کھودنے کے بعد تنکا بھی برآمد نہیں ہوتا۔

رشید الدین صاحب کو بھی ایسے ہی دشوار حالات سے گزرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری بحرِ تحقیق کی غواصی سے کچھ درِ نایاب ان کے ہاتھ لگ ہی گئے جن کو انہوں نے ایک لڑی میں پرو کر اس مقالے کی صورت میں اہلِ نظر کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ وہ اس کو پرکھیں اور قدر شناسی کا حق ادا کریں۔ اس مقالے میں حالاتِ زندگی کی کمی کے باوجود علامہ کی حیات اور شخصیت کے تمام اہم گوشے اس طرح نظروں کے سامنے آجاتے ہیں کہ تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ان کے کارناموں کا بھی مختصر لیکن سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالے میں وہ توازن ہر جگہ موجود ہے جس کے بغیر تحقیق بے وزن ہو جاتی ہے۔ یہ توازن اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب مقالہ نگار کو ایک طرف اپنے موضوع سے پوری ہمدردی ہو اور دوسری طرف وہ اخذ نتائج میں شخصی جذبات اور تعصبات کو راہ نہ دے۔

اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں کم ہی ایسے ہوں گے جو علامہ کے نام سے نا آشنا ہوں لیکن بہت کم لوگ ایسے نکلیں گے جو علامہ کے کارناموں سے بھی واقف ہوں یہ مقالہ علامہ کی شخصیت اور کارناموں کو منظر عام پر لانے کی پہلی اور اس اعتبار سے کامیاب کوشش ہے کہ اسکو پڑھنے کے بعد علامہ کی شعری اور نثری تخلیقات کے مطالعے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے اور یہ تمنا بھی کہ علامہ کی وہ تحریریں جو نایاب ہو چکی ہیں دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ جائیں اور تحقیق مزید میں انکی دستیابی خارج از امکان نہ رہے —— امید ہے کہ رشید الدین صاحب اس مقالے کی اشاعت کے بعد بھی اپنی تلاش جاری رکھیں گے۔ ضرورت ہے کہ علامہ کی غیر مطبوعہ اور کمیاب تحریروں کو بھی مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ یہ کام بھی رشید الدین صاحب کی توجہ کا محتاج رہے گا۔

—— ڈاکٹر مغنی تبسم
ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۲ر مئی ۱۹۷۹ء

حیات

وطنِ عزیز

بدایوں ہندوستان کا ایک قدیم متمدن اور تاریخی شہر ہے۔ اس سرزمین پر بے شمار اولیاء اللہ، عالم اور فاضل ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اردو کے بیشمار شعراء اور ادبا کا بھی یہ مولد و منشار رہا ہے۔ یہ بڑی مردم خیز سرزمین ہے اور ہر زمانے میں اس کی اہمیت رہی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کی جو تنظیم جدید ہوئی ہے اس میں یہ اتر پردیش کے حصہ میں آیا ہے اور ان دنوں اسی نام کے ضلع کا مستقر ہے۔ اس کے شمال میں ضلع بریلی کا کچھ حصہ، مراد آباد اور رامپور جنوب میں فرخ آباد، ایٹہ اور علی گڈھ مشرق میں ضلع بریلی کا کچھ حصہ اور شاہ جہاں پور اور مغرب میں ضلع بلند شہر واقع ہے۔ یہ دو دریاؤں گنگا اور رام گنگا کے بیچوں بیچ بسا ہوا ہے اور دریائے سوتھ اس کے بالکل کنارے سے گذرتا ہے جسے یار وفادار بھی کہتے ہیں۔ بعض لوگ اسے سوت بھی کہتے ہیں بدایوں کی آب و ہوا بے حد خوشگوار ہے۔ اور روہیل کھنڈ کے علاقہ میں یہ ایک شاداب خطہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں یعنی تقسیم ہند سے قبل تک بدایوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن اب یہ صورت حال باقی نہیں ہے۔ اس کے باوجود آج بھی اس شہر پر مسلم کلچر کی گہری چھاپ ہے اور قدم قدم پر مسجدوں کے مینار اور درگاہوں کے گنبد سر اٹھائے اس کی عظمت رفتہ اور مسلم تہذیب کی گواہی دے رہے ہیں۔ یہ شہر صرف مسلم تہذیب ہی کا مظہر نہیں بلکہ یہاں ہندو سطوت کے نشان بھی ملتے ہیں اور مسلمانوں کے اس شہر میں آنے سے پہلے یہ ہندو تہذیب ہی کا مسکن تھا۔

قدیم کتابوں میں بدایوں کا تذکرہ راجہ بھرت کے زمانہ سے ملتا ہے۔ بدایوں۔ قدیم و جدید (مصنفہ نظامی بدایونی) کے مطابق اس کا قدیم نام بدھ گاؤں تھا جسے بدھ نامی راجہ نے بسایا تھا۔ بعد میں یہ بداوں ہو گیا اور پھر بدایوں کہلایا۔ آج بھی اہل بدایوں عام بول چال میں اسے بداؤں ہی کہتے ہیں نیز اس کا انگریزی املا (BADAUN) ہی لکھا جاتا ہے۔ ملا عبد القادر بدایونی نے بھی اپنی تاریخ میں اسے جگہ جگہ بداؤں ہی لکھا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل تک بدایوں ہندو بادشاہوں ہی کے زیر نگین رہا اور اس زمانے کے بنائے ہوئے کئی مندر آج بھی یہاں خستہ حالت میں موجود ہیں۔

جب مسلمان دلی اور پنجاب میں جم گئے تو انہوں نے اتر پردیش کا رخ کیا۔ سب سے پہلے سالار مسعود غازی نے ۱۰۲۸ء میں بدایوں پر حملہ کیا۔ ان کا مزار آج بھی بدایوں میں موجود ہے۔ ۱۱۸۶ء میں اس پر قطب الدین ایبک نے حملہ کیا اور اسے فتح کیا جو شہاب الدین غوری کا غلام اور وزیر تھا۔ شہاب الدین غوری کے بعد (جو لا ولد تھا) خود قطب الدین ایبک ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ اور اس نے اپنے داماد اور غلام شمس الدین التمش کو بدایوں کا گورنر مقرر کیا جس نے یہاں کئی عمارتیں تعمیر کیں جن میں ایک مسجد اور عیدگاہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور آج بھی اسی کے نام سے موسوم ہے۔ بدایوں کی گورنری سے التمش سلطان ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ اور دلی روانہ ہو گیا۔ خلجی اور تغلق خاندانوں کے زمانے میں بھی بدایوں مسلمانوں کے زیر نگین رہا۔ خاندان سادات، پٹھان خاندانوں اور مغل دور میں بھی بدایوں اسلامی تہذیب و فن کا اہم مقام بنا رہا۔ بعد میں یہ روہیلوں کے قبضہ میں آگیا اور دیسی ریاست روہیلکھنڈ کا ایک حصہ بن گیا۔ جب شاہان اودھ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلکھنڈ پر قبضہ کر لیا تو

یہ شہر شاہان اودھ کی علمداری میں شامل ہو گیا لیکن یہ زیادہ دن تک ان کے پاس بھی نہیں رہ سکا۔ اور ۱۸۰۱ء میں روہیلکھنڈ انھیں انگریزوں کے حوالے کر دینا پڑا۔ تب سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یہ انگریزوں کے زیر نگیں رہا اور ۱۸۲۰ء میں ضلع کا مستقر قرار پایا۔ اس سارے عرصہ میں یہ مسلم کلچر اور اردو زبان و ادب کے فروغ کا مرکز بنا رہا۔

آج کا بدایون پوری طرح ایک جدید شہر ہے اور آج بھی یہ اسلامی تمدن اور اردو کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اردو کے کئی چھاپے خانے ہیں اور مقامی طور پر کئی اخبار اور رسائل نکلتے ہیں۔ بدایون میں آج بھی اتنے اولیاء اللہ کے مزارات ہیں کہ اسے "مدینتہ الاولیاء" کہا جاتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا وطن بدایوں ہی تھا اور وہ یہیں سے دلی گئے تھے۔ ان کے والد سید احمد صاحب کا مزار بدایون میں آج بھی مرجع خلائق ہے اور بڑے پیر کا مزار کہلاتا ہے۔ شہداء صالحین اور اولیاء کے مزارات کی اسی کثرت کی وجہ سے اردو کے مشہور شاعر مصحفی نے اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر یہ شعر کہا تھا ؂

ظالم تیری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں
جس کے ہر ایک گھر میں مزار شہید ہے

اردو زبان ادب سے بدایوں کا شروع سے گہرا تعلق رہا ہے اور یہاں کے بعض شاعر و ادیب ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے اور آج بھی ہیں۔ اودھ پنچ گروپ کے مشہور مزاحیہ شاعر احمق پھپھوندوی بدایوں ہی کے تھے۔ عصمت چغتائی اور عظیم بیگ چغتائی کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی (جو انگریزوں کے زمانے میں جج تھے) کا وطن بھی بدایون ہی تھا

اُردو کی مشہور افسانہ نگار بہنیوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا آبائی وطن بھی بدایوں ہی رہا ہے۔ مشہور مزاح نگار اور انشاپرداز محفوظ علی بھی بدایوانی تھے۔ قمرالدین احمد قمر جو اکبر الہ آبادی کے بچپن کے دوست تھے اور جن کی اکبر کے بارے میں کئی کتابیں ہیں ان کا تعلق بھی بدایون ہی سے تھا۔ بدایون شروع سے علماء و فضلاء کی بستی رہی ہے۔ الحاج حضرت مولانا شاہ قاری محمد عبدالحامد قادری مینی بدایونی (جو پاکستان میں مفتی کے عہدہ پر فائز تھے اور جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) بدایون ہی کے متوطن تھے۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی جو اعلیٰ حضرت میر عثمان علیخاں کے زمانے میں ریاست حیدرآباد میں مفتی کے عہدہ پر فائز تھے ان کا تعلق بھی بدایون سے تھا جن کے فرزند مولانا ہادی القادری ہیں جو نظام کالج حیدرآباد میں عربی کے لکچرار ہیں۔ ہادی صاحب اردو کے شاعر بھی ہیں اور ان کے ایک فرزند فکری بدایونی بھی حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور بدایون کی محبت کی وجہ سے اب تک اسی نسبت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں

ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، آل احمد سرور، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور میشر علی صدیقی جیسے نقاد اور محققین کا وطن بھی بدایون ہی ہے اور خاکی بدایونی، شکیل بدایونی، ادا بدایونی، زہرہ نگار، دلاور فگار اور جام نوائی وغیرہ جیسے شاعروں نے سارے ہند و پاکستان میں بدایون کا نام روشن کیا ہے۔ اس سلسلہ میں دلاور فگار کا مزاحیہ قطعہ ملاحظہ ہو

وہ چیزیں کہیں جن کو یوپی کا تحفہ ؎ یہی چار چیزیں ہیں کمیاب و نادر
سندیلے کے لڈو علی گڑھ کے تالے ؎ بریلی کا سرمہ بدایوں کے شاعر

اسی بدایون کے ایک محلہ قاضی ٹولہ میں سید حسن پیدا ہوئے جنھوں

نے علامہ حیرت بدایونی کے نام سے شہرت پائی۔ ہر چند کہ ان کی زندگی کے آخری ۵۰ سے بھی زیادہ سال حیدرآباد میں بسر ہوئے لیکن انھیں بدایون ہمیشہ عزیز رہا اور اس کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ۳۰ سال جو بدایون میں بسر ہوئے انھیں وہ زندگی بھر اپنا سرمایہ عزیز سمجھتے رہے۔

سلسلہ نسب اور خاندان

علامہ حیرت بدایونی ۲۴ر اگست ۱۸۹۶ء (مطابق ۱۵ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ) دوشنبہ کے دن صبح ۱۰½ بجے پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد صدیوں پہلے ایران کے قصبہ سبزوار سے دلی آئے تھے۔ سبزوار شمالی مشرقی ایران کے ضلع خراساں میں واقع ہے۔ ایران کے نامور فلسفی ملا صدرا کا وطن یہی تھا۔ محقق العلماء سبزواری بھی فارسی کے بہت بڑے عالم، فقیہہ اور ادیب گذرے ہیں۔ سبزوار کی آب و ہوا نہایت دلکش ہے اور یہاں کے میوے سارے ایران میں مشہور ہیں۔ یہاں کا گیہوں اپنے اعلیٰ معیار کی بناء پر ملک بھر میں اہمیت رکھتا ہے۔ قدیم زمانہ میں سبزوار کو "دارالعلم" کہتے تھے۔ اور یہ علماء، صلحاء اور فقہا کا مرکز تھا۔ نئے ایران میں یہ قصبہ اپنی زراعت کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔

جس زمانہ میں علامہ کا خاندان منتقل ہوا۔ یہاں مغل بادشاہ حکومت کر رہے تھے۔ چونکہ یہ لوگ عالم فاضل تھے اس لئے عوام میں شامل نہیں ہوئے اور راست دربار میں رسائی ہو گئی اور انھیں ان کے علم و دانش کی بناء

بہ جاگیریں ملیں۔ ان کے جدا علی قاضی محمد جلیس تھے جنھیں اورنگ زیب عالمگیر نے خدمت قضات عطا کی تھی۔ فتاویٰ عالمگیری کے مرتب یہی بزرگ ہیں۔ جنھوں نے اس کی ترتیب کے بعد اس زمانے کے تمام علما سے اس پر دستخط حاصل کیے تھے۔ فقہ حنفی کی یہ کتاب آج بھی مستند و معتبر ہے۔ بعد میں یہ خاندان دلی سے بدایون منتقل ہو گیا۔

علامہ کے والد کا نام محمد حسن اور والدہ کا نام افضل النساء تھا۔ دادا محمد عظمت علی تھے جن کے زمانے تک گھر میں منصف اور صدر اعلیٰ کا عہدہ اور زمینداری بھی رہی مگر والد کے زمانے میں کچھ بھی نہ رہا۔ تعلقدار یاں جائدادیں، املاک یکے بعد دیگرے فروخت ہوتے رہے لیکن ظاہری رکھ رکھاؤ اور وضع داری میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ خود علامہ نے اپنے مجموعہ کلام آئینہ کے دیباچہ میں لکھا ہے "چھوٹی موٹی ملازمت کرنا والد کی شان کے خلاف تھا اور کوئی بڑا عہدہ انگریزوں نے انھیں دیا نہیں۔ میرے بچپن نے گھر کا عروج بھی دیکھا تھا اور نوجوانی نے زوال بھی دیکھا۔"

ان کا بطنی سلسلہ یعنی ننہال بدایون کے فرشوری خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ خاندان بھی ایران کے ایک قصبہ فرشور سے دہلی ہوتا ہوا بدایون آیا اور شاہانِ وقت سے عہدے، منصب اور جاگیریں پائیں۔ ان کے نانا بھی منصف تھے۔ عزیز الدین نام تھا۔ بعد میں علامہ کی شادی اسی خاندان میں ہوئی۔ علامہ صدیقی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔ ان کے ننہال اور ددھیال دونوں کا سلسلہ حضرت ابوبکر سے تھا۔ اس طرح وہ ایک طرفینی صدیقی تھے۔ آج بھی بدایون میں صدیقی بڑے پیمانہ پر آباد ہیں اور ان کا اپنا ایک صدیقی محلہ ہے

بچپن اور تعلیم

محمد حسن صاحب یعنی علامہ کے والد کے گیارہ بچے پیدا ہوتے ہی مر چکے تھے۔ یہ بارہویں اولاد تھے۔ لہٰذا بڑی منتوں مرادوں کے تھے۔ علامہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے پیدا ہونے سے قبل ہی اہتمام شروع کر دیا جاتا ہے۔ علامہ کے دادا اور والد بے حد مذہبی تھے اور سلسلہ قادریہ سے بیعت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے والد مولانا عبدالقادر بدایونی (ہادی القادری صاحب کے دادا) کے مرید تھے۔ جب ان کی بیوی کو بارہواں حمل قرار پایا تو وہ اپنے پیر کی خدمت میں پہنچے اور دست بستہ عرض کیا کہ اللہ کے فضل سے پھر ان کی بیوی کی گود ہری ہوئی ہے۔ اور وہ طالب دعا ہیں۔ پیر نے بھی اس مسرت خیز خبر پر تبسم کیا اور کہا کہ "انشاء اللہ اولاد نرینہ ہوگی۔ اس کا نام حضرت غوث اعظم کے نام پر رکھنا۔ خدا نے چاہا تو طویل عمر ہوگی" بعد میں پتہ چلا کہ پیر کے منہ سے نکلا ہوا لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہوا۔

جب علامہ پیدا ہوئے تو بے حد خوشیاں منائی گئیں اور ننہال اور ددھیال دونوں میں خیرات تقسیم ہوئی اور بچے کی درازی عمر کیلئے دعائیں کی گئیں۔ جب نام رکھنے کا وقت آیا تو پیر صاحب کا خیال آیا۔ چنانچہ ان سے ہی یہ مسئلہ رجوع کیا گیا جنھوں نے بچے کا نام سید حسن رکھا۔ اس طرح حضرت غوث اعظم کے نام کا جز سید ان کے نام کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ ویسے وہ نسبتاً سید نہ تھے۔

علامہ کے ابتدائی چار سال بے حد ناز و نعم میں گزرے کوئی انھیں

زمین پر بھی چلنے نہیں دیتا تھا۔ ہر وقت ماں باپ کی آنکھ کا نور، اور دیگر رشتہ داروں کے دل کا سرور بنے رہتے تھے۔ ان کی نانی انھیں روزانہ اپنے ساتھ سلاتیں اور اچھی اچھی کہانیاں سناتیں۔ علامہ میں ادب کا ابتدائی ذوق یہیں سے شروع ہوا۔ جب وہ سوا چار سال کے ہوئے تو ان کی بسم اللہ نہایت دھوم دھام سے کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ تب تک وہ لکھنا پڑھنا شد بد سیکھ چکے تھے۔ اپنی بسم اللہ کا ایک دلچسپ واقعہ خود علامہ نے اپنے قلم سے لکھا ہے جو مجھے ان کے کاغذات میں ملا ہے اور غیر مطبوعہ ہے:

"تسمیہ خوانی میں بچے کو دولہا بناتے ہیں، سہرا باندھتے ہیں اور پہلے سے تھوڑا بہت پڑھا دیتے ہیں تاکہ بھری محفل میں کچھ تیزی سے پڑھے اور مرعوب نہ ہو جائے۔ چنانچہ ہم بھی ان تمام منازل سے گذرے۔ عصر و مغرب کے درمیان کا وقت بسم اللہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا لیکن مولانا کو آنے میں تاخیر ہوئی اور ہم دولہا بنے دو گھنٹے انتظار میں بیٹھے رہے۔ بعد مغرب وہ قبلہ تشریف لائے۔ اور انہوں نے بڑی محبت سے پیار کر کے ہمیں اپنی آغوش میں بٹھا لیا۔ اور سمجھانے لگے کہ ہم جو پڑھائیں تم پڑھتے جانا۔ ہم نے اقرار میں سر ہلایا۔ بسم اللہ شروع ہوئی۔ دعائیں وغیرہ پڑھوا کر انہوں نے فرمایا کہو الف ہم نے کہا ب۔ انہوں نے پھر فرمایا کہو الف، ہم نے کہا ب، انہوں نے کہا اچھا کہو ب، ہم نے کہا ج۔ والد صاحب نے فرمایا کہ بیٹے تم الف کیوں نہیں کہتے۔ ہم نے کہا وہ تو مولوی صاحب خود کہہ رہے ہیں اس لئے ہم آگے پڑھ رہے ہیں۔

حاضرین محفل اس واقعہ سے بے حد محظوظ ہوئے اور ساتھ ہی بچہ کی ذہانت کی تعریف کی۔ مولوی صاحب نے دعا دی کہ "حسن صاحب! خدا اسے عمر دے آپ کا نام روشن کرے گا"۔

اس کے بعد علامہ کی با قاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق انھیں سب سے پہلے مکتب بھیجا گیا جو محلہ کی ایک مسجد میں قائم تھا اور جہاں روائتی طرز پر عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور قرآن ختم کرایا جاتا تھا۔ چونکہ علامہ بچپن سے ذہین تھے۔ اور پڑھنے پڑھانے سے خصوصی دلچسپی تھی اس لئے بہت جلد مکتب کے اس دور سے گذر گئے جس کے بعد انھیں مدرسہ شمس العلوم میں شریک کرایا گیا جو شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ مسجد شمسیہ میں قائم تھا یہاں انھیں عربی حافظ صفدر صاحب اور فارسی مفتی ابراہیم صاحب نے پڑھائی۔ اس کے بعد مدرسہ قادریہ منتقل ہوئے جو ان کے والد کے پیر مولانا عبدالقادر بدایونی کا مدرسہ تھا۔ عام طور پر مدرسہ شمس العلوم کے اچھے طالب علموں کو جن میں علم کی لگن اور تعلیم کی جستجو ہوتی تھی۔ مدرسہ قادریہ منتقل کر دیا جاتا تھا۔ یہاں مولانا عبدالقادر بدایونی کے فرزند مولوی عبدالقدیر بدایونی سے انہوں نے ادب، فلسفہ اور منطق پڑھی۔ ان کے بڑے بھائی (عبدالمقتدر بدایونی سے جو بعد میں ان کے پیر بھی ہوئے) علامہ نے عربی پڑھی اور مولانا فضل احمد سے تفسیر پڑھی

مدرسہ قادریہ سے فراغت پانے کے بعد علامہ اپنے استاد مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ساتھ مزید تحصیل علم کے لئے رامپور گئے اور وہاں مدرسہ عالیہ میں شریک ہو گئے۔ بعد میں یہ طے کیا گیا کہ چونکہ علامہ کی عربی فارسی استطاعت بے حد اچھی ہے اس لئے انھیں پنجاب یونیورسٹی

کے امتحان مولوی عالم میں بٹھا دیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۱۴ء میں مدرسہ شمس العلوم بدایوں کے طالب علم کی حیثیت سے وہ مولوی عالم کا امتحان دینے دہلی گئے جو اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ مولانا عبدالماجد بدایونی مہتمم مدرسہ ساتھ تھے۔ خواجہ بہاء الدین صاحب کے مکان واقع کوچہ پنڈت میں قیام ہوا۔ امتحان کے دوران ایک دلچسپ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ جو علامہ ہی کے قلم سے سنئے:

"پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا ایک مرکز کرسچن کالج کشمیری گیٹ پر تھا۔ غالباً تیسرے یا چوتھے پرچہ میں ایک لفظ ٹائپ کی خرابی سے پڑھا نہیں جاتا تھا ایک معمر دسن رسیدہ حضرت ہال میں نگرانی کر رہے تھے۔ میں نے ان کو بلا کر پوچھا کہ دوسرا صاف پرچہ دے دیجیے یا بتلائیے کہ یہ کیا لفظ ہے۔ بڑے میاں برہم ہو گئے کہنے لگے الف کا نام لٹھ نہیں آتا اور آجاتے ہیں امتحان دینے۔ یہ سنتے ہی مجھے بھی غصہ آگیا میں نے کہا بڑے میاں منہ سنبھال کر بات کرو بات کرنے کی تمیز سیکھو۔ میری اور ان کی یہ گفتگو بلند آواز سے ہوئی تو دوسرے منتظمین بھی آگئے۔ بڑے میاں نے میری کاپی لی اور لے کر جانے لگے۔ میں نے کہا کہ میں ختم وقت سے قبل کاپی نہیں دوں گا اور میں نے ان بڑے میاں سے زبردستی اپنی کاپی پھر چھین لی۔ بڑے میاں نے قلم سے میری کاپی پر ایک علامت بنا دی۔ ہال میں شور ہوا۔ دوسرے منتظمین نے کچھ مجھے سمجھایا کچھ بڑے میاں کو۔ دوسرے طلباء کے پرچے میں بھی وہ لفظ مشکوک تھا۔ سب نے کہا کہ لفظ پڑھنے میں نہیں آرہا ہے

بالآخر وقت ختم ہوا سب باہر آئے۔ میں سب کا مرکز توجہ کیا ایک تماشہ بن گیا۔ لوگوں نے کہا کہ بڑے میاں اسی کالج کے عربی کے پروفیسر ہیں اور آج کا پرچہ بھی ان ہی کا ہے۔ یہ حضرت تمہیں فیل کر کے رہیں گے۔ دہلی کے بدمزاجوں میں ان کا نمبر اول ہے۔ اب تمہاری خیر نہیں۔ وہاں سے کوچہ پنڈت قیامگاہ واپس آئے تو ماجد بدایونی نے آڑے ہاتھوں لیا۔ زبردست ڈانٹ پلائی۔ کہا دہلی میں ساز دل سے لڑے۔ ہر وقت ساتھیوں دوستوں سے لڑتے ہو اب جا کر ممتحن سے بھی لڑ آئے۔ میں تو تمہیں ساتھ لا کر پچھتایا۔ دوسرے دن صبح ایک پیر جی کے یہاں ہم سب کی چائے اور ناشتہ کی دعوت تھی۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا مگر ماجد میاں زبردستی کر کے لے گئے۔ وہاں جا کر میں رنجیدہ و مغموم ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ پیر جی نے پوچھا کہ یہ لڑکا کچھ بیمار ہے۔ ماجد میاں نے کہا کہ بیمار نہیں بیزار ہے۔ امتحان میں ممتحن پروفیسر سے لڑ آئے۔ پیر جی نے پورا واقعہ سن کر کہا بیٹا پریشان مت ہو آج شام کو میرے پاس آجانا اور میرے عمل کی تاثیر دیکھنا۔ میں نے دل میں سوچا کہ پیر جی مجھے مرید کرنا چاہتے ہیں اور عمل عملیات کا رعب ڈالیں گے۔ آج ان سے بھی لڑائی ہو گی۔ شام ہوئی ماجد میاں نے کہا کہ پیر جی کے پاس جاؤ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ میں نہیں جاتا۔ وہ عمل عملیات کریں گے۔ لڑائی ہو جائے گی۔ ماجد میاں نے زبردستی بھیجا اور تاکید کر دی کہ خبردار کوئی بدتمیزی مت کرنا۔ میں جبراً قہراً پیر جی کے یہاں پہنچا۔ بزرگانہ محبت اور خصوصیت سے پیش آئے

فرمایا تھوڑی دیر ٹھہرو چائے آ رہی ہے۔ اتنی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی ممتحین بڑے میاں آئے اور پیر جی کے ہاتھ پیر چوم کے ادب سے بیٹھ گئے۔ اب میں نے بڑے میاں کو اور بڑے میاں نے مجھے غور سے دیکھا اور پیر جی نے ہم دونوں کو دیکھا۔ چائے آئی سب نے پی۔ پھر پیر جی بڑے میاں سے بولے مولانا ان کو جانتے ہو۔ بڑے میاں بولے کل امتحان ہال میں دیکھا تھا۔ پیر جی نے کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے اور مجھے اپنے بچوں کے برابر عزیز ہے۔ بڑے میاں بولے حضور آپ کا بیٹا ہے تو میرا بھی بیٹا ہے۔ اگر بزرگ اپنے چھوٹوں کو جھڑک دیں تو برا نہیں ماننا چاہیئے۔ پیر جی نے مجھ سے کہا کہ بیٹے اب تم جاؤ۔ کل کے پرچہ کی تیاری کرو۔ (غیر مطبوعہ خود نوشت حالات)

جب نتیجہ آیا تو علامہ اچھے نمبروں سے کامیاب تھے۔ ان کی صاحبزادی جیلانی بانو نے مجھے بتایا کہ علامہ نے طب بھی پڑھی تھی لیکن امتحان کی تیاری کے بعد اس کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی طرح چند برس وکالت بھی پڑھی مگر امتحان نہیں دیا۔ علامہ نے آئندہ زندگی میں بھی ان دونوں علوم سے کبھی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ غالباً وہ ان کے طبعی رجحان کے خلاف تھے۔

شادی اور ملازمت

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۱۸ء میں علامہ کی شادی کر دی گئی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال تھی۔ ان کی شادی ان کے ننھیال میں ہوئی جو بدایوں میں فرشوری خاندان کہلاتا ہے۔ ان کی اہلیہ شکیلہ خاتون پہلے سے ان

کی عزیزہ تھیں۔ کیونکہ علامہ کی والدہ کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ فرشوری بھی بدایون کا ایک معزز گھرانا سمجھا جاتا ہے۔ ان کے خسر اعجاز حسین صاحب تھے جو علی گڑھ کے گریجویٹ تھے اور بدایون میں ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ علامہ کے چار سالے اور دو سالیاں ہیں۔ اعجاز حسین صاحب کی سب سے بڑی لڑکی علامہ کی اہلیہ ہیں۔ ان کی دونوں سالیاں آمنہ خاتون اور میمونہ خاتون بدایون ہی میں بیاہی گئیں۔ چار سالے چار مختلف مقامات پر ہیں سب سے بڑے سالے الیاس حسین فرشوری ہیں جو حیدر آباد ہی میں رہتے ہیں اور سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ان کا بڑا لڑکا اسلم فرشوری آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد میں اسکرپٹ رائٹر ہے اور ایک اچھا ریڈیو، اسٹیج اور فلم آرٹسٹ ہے۔ دوسرے سالے رحمٰن حسین فرشوری بدایون میں رہتے ہیں جو اسلم فرشوری کے خسر بھی ہیں۔ تیسرے سالے ریاض حسین فرشوری ہیں جو پاکستان میں رہتے ہیں اور کراچی میں صحافتی دنیا سے وابستہ ہیں۔ چھوٹے اور آخری سالے قمر حسین فرشوری ہیں جو اپنے والد کی طرح دلی کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔

علامہ اور ان کی اہلیہ میں زندگی بھر بے حد ہم آہنگی رہی۔ انہوں نے زندگی کے تقریباً ۵۰ سال ایک ساتھ گذارے اور کبھی ایک دوسرے کو شکایت کا موقع نہیں دیا بلکہ ہر طرح ایک دوسرے کی خاطر داری کی اور ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھا۔ علامہ کی اہلیہ پڑھی لکھی ہیں اور مضمون نگاری اور شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ وہ عام عورتوں کی طرح کبھی اپنے شوہر کی ادبی سرگرمیوں پر چراغ پا نہیں ہوئیں بلکہ جتنا ہو سکا انھیں جلا بخشی۔ علامہ ایک یار باش آدمی تھے۔ ان کے

پاس ہمیشہ دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ آمدنی کم تھی اور گھر کے اخراجات زیادہ لیکن ان کی اہلیہ نے کبھی تیوری پر بل نہیں آنے دیا۔ اور ہر طرح اپنے شوہر کی دلجوئی کی۔ علامہ کی گھریلو زندگی کے بارے میں مجھے جیلانی بانو نے بتایا۔

"ہمارے یہاں شاعروں کی دعوتیں اور مشاعرے اکثر ہوتے تھے بابا کے بے شمار دوست تھے۔ ان کی خاطر تواضع کرنا، اچھے کھانے کھلانا اور فرمائشیں پوری کرنا اماں کو بے حد پسند تھا۔ اماں نے زندگی بھر کوشش کی کہ کوئی بات بابا کی طبع نازک پر گراں نہ گذرے۔ پولیس ایکشن کے بعد ہمارے یہاں کافی معاشی پریشانی رہی کیونکہ ہم سب بہن بھائی اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ مگر اماں نے یہ سارے مسائل خود حل کئے۔ بچوں کی پڑھائی اور لڑکیوں کی شادی کے مراحل۔ ہر چیز کی ذمہ داری اماں نے خود لی۔ کیونکہ بابا پر جب ذہنی پریشانی کا بار پڑتا تھا تو وہ بیمار پڑ جاتے تھے۔"

علامہ بھی اپنی اہلیہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جیلانی بانو کہتی ہیں۔

"اماں ہائی بلڈ پریشر کی مریض تھیں اس لئے بابا کو ان کی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ گھر میں کوئی ایسا کھانا نہیں پکنے دیتے تھے جو اماں کے لئے مضر ہو۔ اماں تک کوئی پریشان کن خبر نہ جانے پائے اس کی بڑی احتیاط کرتے تھے۔"

علامہ کے خاندان میں شروع سے بچوں کا قحط رہا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں بھی علامہ بے حد خوش قسمت رہے۔ انھیں تین لڑکیاں اور چار لڑکے ہوئے اور سب بقید حیات ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ زیور تعلیم سے بھی آراستہ ہیں۔ ان کے سب سے بڑے فرزند مؤید حسین ہیں عثمانیہ

یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ اور حکومت ہند کے ادارہ سنٹرل ریسرچ لیباریٹری میں سائنٹسٹ ہیں۔ ادب اور آرٹ کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں انہوں نے اپنے والد کو اپنی زندگی میں ہی گھریلو ذمہ داریوں اور فکر معاش سے آزاد کر دیا تھا۔ علامہ کے دوسرے فرزند ڈاکٹر افضل محمد ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی میں جغرافیہ کے ریڈر ہیں۔ تیسرے فرزند احمد جلیس ہیں یہ جامعہ عثمانیہ کے ایم اے ہیں اور ان دنوں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد میں اردو کے پروگرام اگزیکٹیو ہیں۔ احمد جلیس اردو کے اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ خصوصاً مزاح خوب لکھتے ہیں۔ علامہ کے چوتھے اور آخری فرزند محی الدین حسن ہیں۔ یہ بھی عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو کے ایم۔ اے ہیں اور ادب و آرٹ کا بیحد اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اور محکمہ مردم شماری میں ملازم ہیں۔
ان کی ایک کتاب "بیگمات دلی کی زبان" مکتبہ جامعہ سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

علامہ کی سب سے بڑی صاحبزادی عائشہ بانو ہیں۔ یہ بھی مشرقی زبانوں کی گریجویٹ ہیں۔ اور زبان و ادب کا بے حد ستھرا ذوق رکھتی ہیں علامہ کے گھر کی ساری ذمہ داریاں شروع سے ان ہی کے سر ہیں۔ جس طرح موئید حسن صاحب نے علامہ کو ایک طویل عرصہ سے گھریلو ذمہ داریوں اور فکر معاش سے آزاد کر دیا تھا اسی طرح عائشہ بانو نے علامہ کی اہلیہ کو ایک زمانہ سے گھریلو ذمہ داریوں اور چولہے چکی کے جھنجھٹ سے چھٹی دے رکھی ہے۔ علامہ کی دوسری صاحبزادی جیلانی بانو ہیں۔ یہ اردو کی مشہور ادیبہ ہیں۔ حال ہی میں ان کا ناول "ایوان غزل" مکتبہ جامعہ دلی نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ جیلانی بانو اردو کے مشہور شاعر، ڈرامہ نگار اور ادیب ڈاکٹر انور معظم (صدر شعبہ اسلامک

اسسٹنٹ ڈیز عثمانیہ یونیورسٹی) کی اہلیہ ہیں۔ اور خود بھی ان دنوں جامعہ عثمانیہ سے اردو میں پی ایچ۔ ڈی کر رہی ہیں۔ علامہ کی تیسری اور سب سے آخری لڑکی مہر بانو ہیں جو سعودی عرب میں اپنے شوہر رحیم صاحب کے ساتھ رہتی ہیں جو تیل کی مشہور کمپنی آرامکو میں ملازم ہیں۔ مہر بانو بہت اچھی آرٹسٹ ہیں اور سعودی عرب میں مقیم امریکی باشندوں میں ان کی تصاویر کی بڑی مانگ ہے۔ انہوں نے علامہ کی بھی ایک بہت اچھی تصویر بنائی ہے۔ جو ان کے مکان حیرت کدہ واقع ملے پلی میں موجود ہے۔

تعلیم سے فراغت پانے اور شادی کے جھمیلے سے گذرنے کے بعد علامہ نوکری کی طرف رجوع ہوئے۔ جوانی کا جوش اور سر میں شاعری کا سودا یہ دو چیزیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے علامہ اوائل عمری میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کسی کی ذرا سی بات برداشت نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابتدا میں کئی نوکریاں کیں اور چھوڑیں۔ سب سے پہلے وہ گورنمنٹ ہائی اسکول بدایون میں ہیڈ مولوی ہوئے لیکن ہیڈ ماسٹر سے ایک ذرا سے اختلاف کی وجہ سے یہ نوکری چھوڑ دی حالانکہ یہ ان کی افتاد طبع کے لحاظ سے بے موزوں تھی اور اس زمانے کے لحاظ سے تنخواہ بھی اچھی تھی۔ پھر سرکاری ملازمت تھی۔ لیکن یہی سرکاری ملازمت ان کے لئے وبال جان بن گئی کیونکہ اس زمانہ میں ان کے خیالات بے حد مخالف انگریز اور مخالف حکومت تھے۔ وہ برسرِعام انگریزوں اور حکومت وقت کے خلاف تقریریں کرتے پھرتے تھے۔ علامہ بے حد جوشیلے اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ مولانا عبد الماجد بدایونی کی صحبت نے اس پر جلا بخشی تھی جو تحریک خلافت اور عدم تعاون کے زبردست علمبردار تھے۔

سرکاری ملازمت چھوڑ کر علامہ پھر اپنے قدیم مدرسہ شمس العلوم کی طرف رجوع ہوئے اور وہیں عربی کے ٹیچر ہو گئے۔ جب سانحۂ کاٹنے سے مولانا عبد الماجد بدایونی کا اچانک نوجوانی میں انتقال ہو گیا تو یہ مدرسہ شمس العلوم سے نکلنے والے رسالہ "شمس العلوم" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔ لیکن یہاں معاوضہ قلیل تھا۔ اور علامہ کی طبیعت شروع سے سیماب صفت تھی اس لئے یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور انبالہ کرسچن ہائی اسکول میں عربی کے ٹیچر ہو گئے۔ یہاں انھوں نے قدرے طویل مدت یعنی دو سال گذارے۔ لیکن یہ ایک کرسچن اسکول تھا اس لئے علامہ کی عیسائیوں سے بنی نہیں۔ اس لئے یہ پھر بدایوں آگئے اور اب کی بار عیسائیوں کے تلخ تجربہ کی بنا پر اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں میں ملازمت کی۔ لیکن علامہ کی انبالہ میں جہاں کٹر عیسائیوں سے نہیں بنی وہیں بدایوں میں کٹر مسلمانوں سے بھی نہیں بنی اور انھوں نے یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔

اس زمانے میں مولانا عبد القدیر بدایونی کانپور میں تھے اور اپنے معتقدین میں گھرے ہوئے تھے۔ وہاں ان کا اچھا اثر و رسوخ تھا۔ انھوں نے علامہ کی یہ نوکریاں چھوڑنے کی عادت دیکھ کر انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ علامہ کے والد بھی اپنے فرزند کی اس عادت سے سخت عاجز تھے اور چاہتے تھے کہ وہ کہیں مستقل طور پر جم جائیں کیونکہ اب بچوں کی پیدائش کی وجہ سے ذمہ داریوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مولانا عبد القدیر بدایونی تو چند دن میں کانپور سے چلے گئے لیکن انھوں نے وہاں علامہ کو اچھی طرح جما دیا اور حلیم مسلم ہائی اسکول میں انھیں نوکری دلا دی۔ اس ملازمت کا دور علامہ کی اب تک کی ملازمتوں میں سب سے زیادہ یعنی پانچ سال رہا۔

یہ دور علامہ کی زندگی کا اہم دور رہا ہے۔ کانپور کی فضا نے انھیں سحر

واپس آئی اور یہاں ان کی شاعری بھی خوب پروان چڑھنے لگی۔ وہ یہاں کے مشاعروں میں لہک لہک کر غزلیں سناتے اور خوب داد پاتے۔ خوبرو نوجوان تھے۔ کلام عشقیہ ہوتا تھا۔ اور تحت اللفظ سے خاص انداز سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پڑھتے تھے اس لئے خوب خوب داد پاتے تھے۔ ان کے دو سلاموں کا مجموعہ بنام "سلام بحضور خیر الانام" اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۰ء میں باہتمام خواجہ عبدالواحد، انتظامی پریس کانپور میں چھپا تھا۔ اور علامہ نے اسے صوفی عزیز احمد صاحب مہتمم مدرسہ قراۃ القرآن کانپور کی فرمائش پر لکھا اور شائع کیا تھا۔ اس پر ان کا نام حیرت قادری بدایونی چھپا ہوا ہے۔

حیدرآباد کو منتقلی

لیکن کانپور میں ایک مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ علامہ ادب سے زیادہ مذہب اور مذہب سے زیادہ سیاست کے ہو کر رہ گئے اور یہی چیز ان کے کانپور چھوڑنے کا باعث ہوئی اس زمانے میں ترکی کی تائید میں عام طور پر ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت زیادہ جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ خلافت تحریک زوروں پر تھی اور جنگ بلقان کے واقعات نے مسلمانوں کو انگریزوں کے شدید خلاف کر دیا تھا۔ ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں آباد تھے روزانہ جلسے ہوتے تھے اور انگریزوں پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ کانپور میں تو یہ جذبہ کچھ زیادہ ہی شدید تھا کیونکہ اس زمانے میں یہاں مچھلی بازار میں واقع ایک مسجد کو مقامی انگریز حکام نے شہید کر دیا تھا۔ اس واقعہ پر نہ صرف کانپور

میں شدید احتجاج کیا گیا بلکہ اس کی بازگشت سارے ہندوستان میں سنی گئی اور آج بھی تاریخ کے اوراق پر محفوظ ہے۔

مولانا آزاد سبحانی کی صحبت نے جو اس زمانہ میں مدرسہ الہیات کانپور کے پرنسپل تھے۔ علامہ کو پکا باغی بنا دیا اور وہ حکومت وقت اور انگریزوں کے خلاف اور خلیفہ ترکی و مسلمانوں کی تائید میں علانیہ تقریریں کرنے لگے۔ عالم یہ تھا کہ آج اس مسجد میں جلسہ ہے تو کل اس محلہ میں پرسوں اس میدان میں جلسہ ہے تو ترسوں اس گلی میں۔ جلسوں کے بڑے بڑے پوسٹرس چھپتے تھے۔ جن میں علامہ کا نام جلی حروف میں لکھا ہوتا تھا۔ اور کانپور کے لوگ بدایون کے خطیب کو سننے کے لئے جوق در جوق جمع ہوتے۔ چونکہ یہ جس مدرسہ میں ملازم تھے۔ وہ خانگی تھا اور مسلمانوں ہی کا تھا اس لئے انہیں ملازمت کی طرف سے بے فکری تھی۔ اور وہ ان کی سرگرمیوں میں مانع نہیں تھی۔

جب معاملہ زیادہ بڑھا تو علامہ کے والد کو فکر دامنگیر ہوئی کیونکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ علامہ کسی بھی وقت گرفتار ہو سکتے تھے۔ ان کے ہر جلسہ میں سی آئی ڈی کے لوگ ہوتے تھے اور برابر رپورٹیں اعلیٰ حکام تک پہنچ رہی تھیں۔ اس زمانہ میں مولانا عبدالقدیر بدایونی حیدرآباد میں تھے اور یہاں کے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں ان کا اچھا اثر تھا چنانچہ علامہ کے والد جناب محمد حسن نے فوراً انہیں لکھا کہ آپ نے ہی سید حسن کو کانپور میں جمایا تھا لیکن اب یہ شہر اس کے رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اس لئے اسے فوراً حیدرآباد بلالیا جائے اور وہیں جمادیا جائے۔ یہاں اس کا رہنا کسی طرح بھی دانشمندی نہیں ہے۔

چنانچہ یہاں سے مولانا عبدالقدیر بدایونی [illegible] وہ خود اُ
حیدرآباد آجانیوالے۔ اپنی حیدرآباد میں آمد کے بارے میں، علامہ نے خود "آئینہ"
کے دیباچہ میں لکھا ہے"۔

"خلاف تحریک زوروں پر تھی میری غیر ذمہ دارانہ تقریروں نے
مجھے مجبور کر دیا کہ میں گرفتار ہونے سے قبل راہ فرار اختیار کر لوں
چنانچہ راقم رات شہر سے غائب ہو گیا۔ ایک ہفتہ بعد شہر
والوں کو معلوم ہوا کہ میں حیدرآباد میں خیریت سے ہوں۔ دسمبر
۱۹۲۲ء میں آیا اور جنوری ۱۹۲۲ء میں حلف نامہ داخل کر کے
ملکی صداقت نامہ لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا ایمان سلامت ہے
وہ دن اور آج کا دن پچاس برس بیت گئے ہیں۔ اپنے عہد پر
قائم ہوں۔ اب بدایوں پردیس ہے اور حیدرآباد میرا دیس"۔

اس طرح علامہ ذریعہ ٹرین اور منماڑ و اورنگ آباد حیدرآباد
آ گئے اور پھر ایسے آئے کہ یہیں کے ہو رہے اور اسی خاک میں آسودہ
خواب ہیں۔

مہاراجہ کی ملازمت اور مصاحبت

مولانا عبدالقدیر بدایونی کا اس زمانہ میں حیدرآباد
میں اچھا اثر و رسوخ تھا اور ان کے خاندان کی مذہبی حیثیت اور خود ان کی ذاتی
لیاقت کی وجہ سے یہاں لوگ ان کی بے حد عزت و احترام کرتے تھے۔ اور
یہاں لوگ ان کی بے حد عزت و احترام کرتے تھے۔ اور یہاں ان کے بہت
سے مرید بھی تھے اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علیخاں تک انکی رسائی تھی اور تمام امیر امراء اور
طبقہ خواص ان سے واقف تھا۔ بعد میں وہ یہاں مفتی کے عہدہ پر مامور ہو گئے تھے جو عدالت دینیہ کے

نج کے مساوی عہدہ تھا اور مذہبی مقدمات میں فیصلہ دیتے تھے۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی اس زمانہ میں حیدرآباد کے ایک رئیس غلام غوث خاں کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ نظپورہ میں ان کی شاندار ڈیوڑھی تھی بعد میں انھیں بادشاہ وقت میر عثمان علی خاں نے غوث یار جنگ کا خطاب دیا یہ کورٹ آف وارڈ کے ناظم بھی تھے۔

مولانا عبدالقدیر بدایونی نے علامہ حیرت کو بھی یہیں ٹھہرایا۔ مولانا کی وجہ سے غلام غوث خاں صاحب بھی علامہ سے بہت تپاک سے ملے اور ہر طرح ان کی مہمان داری کی۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی علامہ کی سیماب صفت کی وجہ سے بہت ڈر رہے تھے کہ پتہ نہیں وہ یہاں بھی ٹک کر رہتے یا نہیں لیکن شہر حیدرآباد علامہ کو پہلی نظر میں ہی پسند آگیا اور وہ اس کے ایسے دالہ و شیدا ہوئے کہ اپنی عمر کی باقی نصف سے بھی زیادہ صدی یہیں گذار دی۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی اور غوث یار جنگ کی وجہ سے علامہ زیادہ دن تک اجنبی نہیں رہے اور انہوں نے بہت جلد طبقۂ خواص اور حلقۂ شعر و ادب میں اپنی جگہ بنالی۔

غوث یار جنگ نے نہ صرف علامہ کو قیام و طعام کی سہولتیں بہم پہنچائیں بلکہ انہیں روزگار سے بھی لگایا اور نواب کلیانی کا اتالیق مقرر کر دیا۔ لیکن ایسی نوکری سے کیا ہو سکتا تھا اس لئے مولانا عبدالقدیر بدایونی نے مدرسہ آصفیہ میں ان کے لئے خاص طور پر مودب کی ایک جگہ قائم کروائی اور اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔ ان کا کام مدرسہ کے لڑکوں کو ادب و اخلاق سکھانا تھا۔ دو سال تک علامہ نے اس پوسٹ پر کام کیا اور اس کے بعد ان کی طبیعت اوب گئی۔ چنانچہ ۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ ملازمت چھوڑ دی۔

اسی زمانے میں ان کی ملاقات مہاراجہ سرکشن پرشاد سے ہوئی۔ علامہ حضرت غوث پاک کے بہت زیادہ معتقد تھے اور مہاراجہ سے ان کی ملاقات اپنے ان ہی پیر کی وساطت سے ہوئی تھی۔ مغل پورہ میں حضرت غوث پاک کا ایک چلہ ہے جو عرف عام میں خواجہ کا چلہ کہلاتا ہے۔ ربیع الثانی کی ۱۱ تاریخ تھی (جو حضرت غوث اعظم کا یوم وصال ہے) مغل پورہ میں چلہ پہ عوام کا ہجوم تھا۔ علامہ بھی غوث یار جنگ اور مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ساتھ پہنچے اور فاتحہ گزرانی۔ اتنے میں کچھ شور بلند ہوا۔ ہٹو بڑھو کی آوازیں آئیں۔ یہ اصل میں مہاراجہ کشن پرشاد کی سواری تھی جو حضرت غوث پاک کے بے حد معتقد تھے اور اپنے ایک لڑکے کا نام ان ہی کے نام پر خواجہ پرشاد رکھا تھا۔

مہاراج نے نیاز پیش کی۔ غوث یار جنگ اور مولانا عبدالقدیر نے سلام کیا تو ان کی طرف متوجہ ہوئے اور خیریت پوچھی۔ پھر ان کے ساتھ ایک نئے نوجوان کو دیکھ کر اس کے بارے میں پوچھا۔ اب علامہ کا نمبر تھا۔ انہوں نے جھٹ سے حیدرآبادی طرز پہ سلام کر دیا۔ مہاراج باہر کے ایک نوجوان کی اس ادا سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے بارے میں مزید باتیں پوچھیں۔ معلوم ہوا کہ بدایون کے رہنے والے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اور شاعر بھی ہیں۔ مہاراجہ نے انہیں کل اپنی دیوڑھی میں لانے کو کہا۔ اس وقت تک وہ ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم نہیں ہوئے تھے

دوسرے دن غوث یار جنگ اور مولانا عبدالقدیر بدایونی علامہ کو

لے کر مہاراجہ کی دیوڑھی پہنچے مہاراجہ بے حد مہربانی سے پیش آئے۔ اپنے قریب بٹھایا اور کلام سُنا۔ پھر اپنا کلام سنایا جس کی علامہ نے دل کھول کر داد دی بعض اشعار کی داد اور اس پر خیال آرائی کے دوران مہاراجہ نے ان کی اہلیت کا پتہ چلا لیا اور اسی وقت اپنی مصاحبت میں لینے کا فیصلہ کر لیا اتنے میں خاصہ تیلا ہے کی آواز بلند ہوئی۔ مہاراجہ کی عادت تھی کہ کھانا کبھی اکیلے نہیں کھاتے تھے بلکہ جتنے لوگ موجود ہوں سب کو شریک طعام کرتے تھے اور کھانا بھی انتہائی پر تکلف ہوتا تھا۔ پھر مہاراجہ مہمانوں کو خاص اصرار سے کھلاتے تھے۔ چنانچہ علامہ نے بھی پہلی بار مہاراجہ کے دستر پر کھانا کھایا اور اپنی طبیعت، گفتگو اور شاعری سے مہاراجہ کو اتنا متاثر کیا کہ اس کے بعد علامہ کے بغیر ان کا نوالہ ہی نہیں اترنے لگا ....

علامہ کی مہاراجہ کے دربار میں بڑی پر تکلف صحبتیں رہیں۔ علامہ جوش ملیح آبادی کے بہت بے تکلف دوست تھے اور انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی بارات" میں ان کا اپنے دوستوں کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

لیکن علامہ حیدرآباد محض تفریح کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ روزگار کی تلاش میں آئے تھے۔ بدایون میں ان کے بیوی بچے تھے اور اب وہ ایک ذمہ دار آدمی بن چکے تھے۔ اس لئے صرف ایسی مصاحبت میں وہ زیادہ دن نہیں گذار سکتے تھے۔ ویسے طبیعت کے خود دار بھی بہت تھے۔ مہاراجہ کی مردم شناس نظروں نے اس کیفیت کو بھانپ لیا اور انھیں اپنے لڑکے خواجہ پرشاد کی اتالیقی پر مقرر کیا۔ باضابطہ تنخواہ مقرر کی اور منل پورہ سے اپنی دیوڑھی ہی کے ایک حصہ میں شاہ علی بندہ بلالیا۔ اس کے بعد

علامہ نے بدایوں سے اپنے بیوی بچوں کو بھی بلالیا اور اس طرح حیدرآباد میں ان کے قدم جم گئے

دس سال تک علامہ اس طرح رہے۔ اس اثنا میں کئی واقعات ہوئے۔ مہاراجہ وزیر اعظم بن گئے اور ان کے اثر و رسوخ میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ یہ زمانہ اردو کی انتہائی ترقی کا تھا لوگ دور دراز سے آرہے تھے اور یہاں اچھی ملازمتیں پا رہے تھے۔ لیکن علامہ کی طبیعت میں جو استغنا تھا اس نے انھیں اسی میں خوش رکھا تھا۔ تاہم مہاراجہ خود چاہتے تھے کہ علامہ کو کوئی اچھی ملازمت مل جائے ۔ اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ جامعہ عثمانیہ میں اردو کی پروفیسری خالی ہے ۔ مہاراجہ نے وائس چانسلر (جسے اس زمانے میں نائب معین جامعہ کہا جاتا تھا) کے نام رقعہ دیا کہ یہ میرے خاص آدمی ہیں۔ نہایت قابل ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں اچھی استطاعت رکھتے ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر ہیں اگر انھیں یہ خدمت مل جائے تو یقیناً اس خدمت کے ساتھ انصاف ہوگا۔

علامہ نے رقعہ لیا اور تین دن تک جیب میں لئے پھرتے رہے۔ دراصل ان کی طبیعت میں کسی کا احسان لینا نہ تھا خواہ وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔ یہاں دو لوگوں کے احسان کا سوال تھا۔ ایک مہاراجہ اور دوسرے وائس چانسلر۔ آخر چوتھے دن دوست احباب اور گھر والوں کے کہنے پر طوعاً کرہاً یونیورسٹی پہنچے ۔ ابھی وائس چانسلر سے ملنے اور رقعہ دینے بھی نہ پائے تھے کہ معلوم ہوا کہ اردو کی پروفیسری کے لئے خاص طور پر وحید الدین سلیم کو بلایا گیا ہے اور وہ حیدرآباد آچکے ہیں بلکہ اس وقت وائس چانسلر

...... کے چیمبر میں موجود رہیں۔ علامہ نے اطمینان کی سانس لی اور گھر واپس ہوئے بعد میں جاکر ساری روداد مہاراجہ کو سنائی اور گلو خلاصی کی۔ یہ واقعہ مجھے علامہ کے فرزند احمد جلیس نے بتایا۔

لیکن مہاراج کہاں خاموش بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے منصوبہ پر نظر کر کے ایک اور موقعہ نکالا۔ در اصل مہاراج ایک ایسے آدمی تھے جو جود و کرم اور احسان و مروت کے بہانے ڈھونڈتے تھے پھر علامہ تو ان کے خاص اور رات دن کے آدمی تھے۔ اگر وہ ان کے لئے کچھ نہ کرتے تو پھر کس کے لئے کرتے۔ چنانچہ ایک بار مہاراج نے انہیں جاگیر دار کالج میں عربی کا استاد مقرر کر دیا۔ یہ کالج اس زمانے میں طبقہ خواص کیلئے مختص تھا اور اس زمانہ میں اس کالج میں ملازمت کرنا بہت بڑا اعزاز تھا اور یہاں تنخواہیں بھی بہت معقول تھیں۔ لیکن علامہ نے یہ نوکری صرف تین دن کی۔ وجہ جیلانی بانو کے الفاظ میں پڑھیئے۔

"ابا نے جاگیر دار کالج میں صرف تین دن کام کیا۔ چوتھے دن اعلیٰحضرت کے قریب رہنے والا ایک اہم شخصیت نے (جو ملکی اور غیر ملکی فضاد پیدا کرنے میں مشہور تھی) ابا سے کہا کہ یہ سب ان کی بدولت ہوا ہے۔ جن کے لئے ابا کو زندگی بھر ان کا مشکور رہنا چاہیئے۔ یہ سنتے ہی ابا نے استعفیٰ لکھ کر میز پر رکھا اور پھر کالج نہیں گئے۔"

سرکاری ملازمت

علامہ کے اس رویہ نے مہاراجہ

سخت الجھن میں ڈال دیا۔ وہ تو ان کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے اور یہ حضرت اپنی خودداری کو ٹھیس نہ لگنے دیتے تھے۔ جاگیر دار کالج کے تلخ واقعہ کے بعد علامہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی کسی کی سفارش سے حیدر آباد میں کوئی بڑی ملازمت نہیں کریں گے اور اپنے حسب حیثیت جو بھی ملازمت اپنے طور پر مل جائے وہ کر لیں گے اور کسی کا احسان نہیں اٹھائیں گے دراصل اب وہ مہاراجہ کی مصاحبت اور دربار داری سے بھی اکتا گئے تھے اور کئی بار وہ مہاراجہ سے زبانی اس کا تذکرہ بھی کر چکے تھے۔ مہاراجہ نے جب ان کے یہ خیالات دیکھے تو انھیں اپنے تحت باب حکومت میں کلرک مقرر کر دیا۔ تھوڑے دن بعد وہ امور مذہبی میں منتقل ہو گئے اور اہلکار درجہ دوم بن گئے۔

اب انہوں نے مہاراجہ کا مکان بھی خالی کر دیا اور بچوں کے لئے ان کے پاس سے جو تعلیمی وظیفہ ملتا تھا وہ بھی واپس کر دیا۔ چونکہ علامہ سرکاری ملازمت میں آ چکے تھے اس لئے انھیں لال ٹیکری میں آرائش بلدہ کا ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ اور علامہ اپنی خوددار طبیعت کی وجہ سے اسی چھوٹے سے مکان اور چھوٹی سی ملازمت میں مسرور و شاداں رہنے لگے بعد میں وہ امور مذہبی میں منتظم ہو گئے اور ان کے ایک دوست کے مکان واقع ریلے بلی منتقل ہو گئے۔ یہ بھی آرائش بلدہ ہی کا کوارٹر تھا لیکن کونے پر ہونے کی وجہ سے دوسرے مکانوں سے بڑا تھا۔ بعد میں ان کے دوست پاکستان چلے گئے اور یہ مکان علامہ کے نام ہو گیا جو پابندی سے اس کی قسطیں ادا کرتے رہے۔ آخر تک علامہ اسی مکان میں رہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں انگریز ہندوستان سے چلے گئے اور ہندوستانی

پاکستان، ہندوستان دو ملک کے نام سے وجود میں آ گئے۔ دیسی ریاستوں کے متعلق انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ چاہیں تو آزاد رہیں یا چاہیں تو ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہو جائیں۔ ریاست حیدرآباد سب سے بڑی ریاست تھی۔ جہاں کا حکمران مسلمان تھا۔ اور رعایا کی اکثریت ہندو تھی۔ چونکہ یہ ریاست چاروں طرف سے ہندوستان سے گھری ہوئی تھی اور رعایا کی اکثریت ہندو تھی۔ اس لئے ہندوستانی حکومت یہ چاہتی تھی کہ حیدرآباد ہندوستان یونین میں شامل ہو جائے۔ لیکن حکومت حیدرآباد نے آزاد رہنا پسند کیا۔

اسی زمانے میں ریاست حیدرآباد میں سید قاسم رضوی کی قیادت میں رضاکار تحریک نے زور پکڑا۔ جس کی وجہ سے ایک طرف یہاں کی فضا مسموم ہو گئی اور دوسری طرف ہندوستانی حکومت سے ریاست حیدرآباد کے تعلقات بے حد خراب ہو گئے۔ ریاست حیدرآباد چاروں طرف سے ہندوستان سے گھری ہونے کی وجہ سے اس کی معاشی ناکہ بندی کر دی گئی اور یہاں کے لوگ معمولی ضروریات زندگی کے لئے بھی ترس گئے۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں ہر طرف مخالف ہند فضاء پائی جاتی تھی جس نے بعد میں فرقہ پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ علامہ بھی ایک جذباتی آدمی تھے۔ چنانچہ اس فضاء سے وہ اپنے آپ کو نہ بچا سکے اور اس زمانے میں انہوں نے "لیڈیز فرسٹ" نامی ایک موضوعاتی کتاب لکھی۔ اس کا دیباچہ اس زمانہ کی مشہور شخصیت قاسم رضوی نے لکھا تھا جس میں انہوں نے بھی اس

بات کا اعتراف کیا تھا کہ "اس میں کہیں کہیں حد سے تجاوز کیا گیا ہے"۔

ایک سال تک ریاست حیدرآباد کی یہ فضا باقی رہی اور ستمبر ۱۹۴۸ء میں ہندوستانی حکومت نے پولیس ایکشن کے ذریعہ اسے انڈین یونین میں شامل کر لیا۔ ہر چند کہ حکومت ہند نے اس زمانے میں حیدرآباد میں فراخدلی سے کام لیا۔ اور بعد میں تمام سیاسی مجرمین کو عام معافی دے دی لیکن ایک سال تک یہاں جو فضا پروان چڑھی تھی اس کا ردعمل ہونا ضروری تھا۔ اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اور حکومت کی زبان اردو تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان دونوں انگریزی کر دیئے گئے۔ جس کے نتیجہ میں بڑے پیمانہ پر اردو داں ملازمین کی تخفیف عمل میں آئی اور خوف وہراس کی فضا پیدا ہو گئی۔

چونکہ علامہ بھی اردو داں تھے اور انگریزی سے نابلد تھے اس لئے ان کی ملازمت بھی خطرہ میں آ گئی لیکن چونکہ یہ بہت پرانے ملازم تھے اس لئے ان کی تخفیف تو نہ کی جا سکی لیکن ان کا تنزل کر دیا گیا لیکن یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ انہوں نے تنزل سے وظیفہ پر علحدگی کو ترجیح دی اور درخواست دے کہ وظیفہ حسن خدمت پر علحدہ ہو گئے حالانکہ اس زمانے میں ان کے حالات قطعی ایسے کسی اقدام کے متقاضی نہیں تھے۔ ان کے تمام بچے پڑھ رہے تھے اور ملازمت کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ لیکن علامہ ایک ایسے آدمی تھے جو کبھی حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالتے تھے۔ بقول جیلانی بانو ہے۔

حالات سے شکست کھانا انہوں نے نہیں سیکھا تھا۔ جس کا ارادہ کر لیتے تھے اسے ہر حیثیت پر پورا کر کے چھوڑتے تھے۔"

اس زمانے میں انہوں نے حصول معاش کے لئے بہت سے کام کئے۔ اخباروں میں مزاحیہ کالم لکھے۔ رسالوں میں تبصرے لکھے۔ سینما کے اشتہار بنائے اور قدیم شاعروں کے پبلشروں کی فرمائش پر دیوان مرتب کئے۔ جن پر ان کا نام نہیں ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے فانی بدایونی کی خیابات مرتب کی تھی جس پر قاضی عبدالغفار کا مقدمہ ہے اور جسے شبیر حاتمی نے شائع کیا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے ایڈن کمپنی میں کام کیا تھا جو اس زمانے کی مشہور اشتہاری کمپنی تھی۔ علامہ کا کام نئی فلموں کی اخباروں میں پبلسٹی کے لئے مناسب مواد لکھنا تھا۔ چونکہ انہیں فلموں اور دیگر فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی اس لئے وہ یہ کام بخوبی انجام دے لیتے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ادبی ماہنامہ "چراغ" جاری کیا لیکن اس کے صرف چند شمارے ہی نکل سکے۔

جب ان کے بڑے فرزند خورشید حسن بی کام ہونے کے بعد ملازم ہو گئے تو علامہ کی یہ تمام سرگرمیاں اور تگ و دو ختم ہو گئی اور وہ آئینا کے ساتھ شاعری کرتے ہوئے گھر بیٹھ گئے۔ بعد میں یکے بعد دیگرے ان کے دوسرے لڑکے بھی تعلیم ختم کر کے ملازم ہوتے گئے اور ان کے گھر میں معاشی فارغ البالی آ گئی۔ چنانچہ اپنے آخری ایام میں علامہ کے گھر پر موٹر بھی موجود تھی اور ان کا مکان دو منزلہ بن چکا تھا۔

آخری ایام اور انتقال

علامہ کے آخری ایام بے حد

اطمینان سے گذرے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہ نہ صرف حیدر آباد بلکہ پورے ہندوستان میں بے حد مشہور ہو چکے تھے۔ دور دراز کے مشاعروں سے انھیں بلاوے آتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کا کوئی ایسا بڑا یا چھوٹا شہر نہیں تھا جہاں انھیں مدعو نہ کیا گیا ہو اور انہوں نے مشاعرہ نہ پڑھا ہو حتیٰ کہ اس زمانے میں وہ تین بار پاکستان بھی گئے اور مشاعرے پڑھ کر لوٹے۔ حضور عالم پاکستان میں ان کے ایک دوست اور رشتہ دار تھے۔ کراچی میں ان کے پاس ٹھہرتے تھے۔ لاہور میں ان کے تیسرے سالے ریاض زنشوری تھے۔ لاہور جاتے تو ان کے پاس ٹھہرتے۔ ویسے بھی پاکستان کے ہر شہر میں ان کے دوست، ملاقاتی اور شناسا تھے۔ جن میں جوش ملیح آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے انھیں خاص عقیدت تھی اور کئی بار اجمیر جا چکے تھے۔ ایک بار اجمیر کے سفر میں ان کے دوست حاجی بشیر احمد خاں بھی ان کے ساتھ تھے جنہوں نے مجھے بتایا کہ وہاں جس طرح علامہ کو شاندار پیمانے پر ٹھہرایا گیا اور ان کی جو آؤ بھگت ہوئی وہ اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ سجادہ صاحب کے پاس بھی ان کی محفل شعر منعقد ہوئی اور پر تکلف دعوت کی گئی

حاجی صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اجمیر کے علاوہ علامہ کے ساتھ ہندوستان کے دیگر کئی مقامات کا سفر کیا جن میں بدایوں اور لکھنؤ بھی شامل ہے۔ ویسے تو علامہ بذات خود ایک دلچسپ اور زندہ دل شخص تھے لیکن سفر میں ان کی شخصیت اور بھی دلچسپ ہو جاتی تھی۔ پان کھاتے جاتے تھے حقہ پیتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ ساتھیوں سے بھی اور ریل کے دیگر مسافرین سے بھی۔ بیچ بیچ میں دلچسپ فقروں اور لطیفوں

سے محفل کو گرم رکھتے تھے۔ پھر جو اسٹیشن آتا اس مقام کی خصوصیات اور پس منظر بتاتے۔ نام پر بحث کرتے۔ غرض ان کے ساتھ بڑے سے بڑا سفر کب کٹ جاتا تھا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ باتوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تو بیاض نکالتے اور بغیر فرمائش کیے شروع ہو جاتے۔ ویسے عام زندگی میں وہ سوائے مشاعروں یا دوستوں کی مخصوص محفل کے مشکل ہی سے شعر سناتے تھے

مجھے علامہ کو ان کی زندگی کے آخری ۱۵ سال میں دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس عرصہ میں میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا۔ اصل میں ان کے تیسرے فرزند احمد جلیس میرے دوست تھے۔ اور میں ہر اتوار کو صبح ناشتہ کے بعد پابندی سے ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ جہاں علامہ بھی دیوان خانہ میں بیٹھے ہوتے۔ لیکن مجھے کبھی ان سے ان کی شاعری یا حالات زندگی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ان کی حیثیت ایک بزرگ کی سی تھی اور وہ جو کچھ کہتے ہم لوگ بیٹھے سنتے رہتے۔ بیچ میں کچھ بول لینے یا پوچھنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی حالانکہ وہ روایتی قسم کے نک چڑھے بزرگ کبھی نہیں رہے۔ مجھ سے اکثر وہ میرے وطن اورنگ آباد کے بارے میں پوچھتے تھے جس میں یعقوب عثمانی صاحب کا تذکرہ ضرور شامل رہتا۔

یعقوب کیسے ہیں؟ وہ پوچھتے

اچھے ہیں، میں جواب دیتا

حالانکہ وہ اور میں دونوں حیدرآباد میں ہوتے اور یعقوب صاحب اورنگ آباد میں۔ لیکن وہ ان کی خیریت معلوم کر کے ہمیشہ اطمینان کا سانس لیتے۔ یعقوب عثمانی میرے استاد رہ چکے ہیں۔

اور اردو کے بہت اچھے اور کہنہ مشق شاعر تھے ۔ ان کے دو مجموعے "شرر نغمہ" اور "سنگ میل" شائع ہو چکے ہیں ۔ ویسے وطن بارہ بنکی (یوپی) ہے لیکن علامہ کی طرح اورنگ آباد ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اور اس شہر کے بارے میں بے حد رطب اللسان رہتے تھے ۔ ان کے فرزند یوسف عثمانی اور بہو رعنا حیدری بھی اردو کے نوجوان شعراء میں اور ان کا ایک مشترکہ مجموعہ کلام بھی شائع ہو چکا ہے ۔

یعقوب عثمانی علامہ کے اچھے ملنے والوں میں سے تھے اور ان سے خاص تعلق خاطر رکھتے تھے ۔ مجھے دیکھتے ہی شاید انھیں اپنے دوست کی یاد آ جاتی تھی ۔ اکثر جلیس سے کہتے

"ارے بھئی دیکھو وہ یعقوب کا اورنگ آبادی شاگرد آ گیا ہے"

مجھ سے ہمیشہ "رشید صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ میں ان سے بہت زیادہ چھوٹا ہوں اور ان کے بچوں کا ملنے والا ہوں ۔"

علامہ کے آخری ایام ادبی سرگرمیوں میں گذرے اور یہ دور ان کی ادبی زندگی کا بے حد کامیاب دور ہے ۔ ان کے پاس تجربہ کی دولت تھی ۔ اطمینان اور سکون تھا ۔ صحت بھی بحیثیت مجموعی اچھی رہتی تھی اس لئے وہ پوری طرح لکھنے پڑھنے کی طرف راغب رہے

ان کی بڑی صاحبزادی عائشہ بانو نے مجھے بتایا کہ :

"بادا دن کا بڑا حصہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے ۔ عام طور پر وہ ناشتہ کے بعد نو بجے اپنی لکھنے کی میز پر جاتے اور دوپہر تک لکھتے رہتے ۔ پھر دوپہر کا کھانا کھا کر اور ظہر کی نماز پڑھ کر

سو جاتے تھے۔ اٹھنے کے بعد چائے پیتے اور پھر کچھ پڑھتے یا لکھتے۔ اس اثنا میں گھر والوں سے بات چیت بھی کرتے رہتے اور گھر میں ادھر ادھر کسی کام سے اٹھ کر بھی جاتے۔"

علامہ نے اپنی زندگی میں نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا لیکن کبھی اسے سنبھال کر نہیں رکھا۔ مسودوں کی تو بات چھوڑ دیئے ان کے پاس اپنی مطبوعہ چیزیں بھی نہیں تھیں۔ رسائل اور اخبارات تو درکنار ان کی مطبوعہ کتابوں کی بھی کوئی جلد ان کے پاس نہیں تھی۔ دراصل وہ ایک فطری شاعر اور ادیب تھے۔ انھیں اپنی چیزیں اہتمام سے رکھنا، لوگوں میں ان کی نمائش کرنا اور انھیں سنبھال کر رکھنا قطعی پسند نہ تھا۔ وہ نام و نمود کے قائل نہ تھے۔ کسی اندرونی جذبہ سے متاثر ہو کر لکھ دیتے اور پھر بھول بھال جاتے۔ ان کی اکثر غزلیں اور مضامین اور کتابیں ایڈیٹروں اور پبلشروں کے تقاضوں سے چھپیں۔ البتہ اپنے آخری ایام میں انھوں نے اپنی دو کتابیں نہایت دلچسپی اور اہتمام سے شائع کیں۔ ایک اپنا فارسی مجموعہ کلام "ابریق" اور دوسرا اردو مجموعہ کلام "آئینہ"؛ حالانکہ یہ بھی ان کا پورا شعری سرمایہ نہیں کہا جا سکتا۔ بقول جیلانی بانو:

"آئینہ" میں ان کا بہت تھوڑا منتخب کلام ہے۔ میرے اندازہ کے مطابق ان کی سو ڈیڑھ سو اردو، فارسی غزلیں اور نظمیں اور عربی غیر مطبوعہ کلام ہے۔ نثر کے کئی مضامین اور امیر خسرو کی فارسی شاعری پر پوری کتاب کا مسودہ لکھا ہوا ہے۔"

مجھے اس مقالے کی ترتیب کے وقت علامہ کا بہت کم اردو غیر

مطبوعہ کلام ملا ہے۔ جیلانی بانو نے امیر خسرو پر جس مکمل مسودہ کا اوپر ذکر کیا ہے، وہ صرف چند کاغذات پر مشتمل ہے جو میں نے احمد جلیس سے حاصل کئے۔ دراصل علامہ اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں کسی کو شریک نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کو ان کی الماری اور کاغذات کو ہاتھ لگانے کی اجازت تھی۔ ان کے اکثر مسودات اور کاغذات لفافوں میں رکھے ہوئے ملے جن میں کوئی ترتیب اور تسلسل نہیں ہے۔

مرنے سے چند سال قبل "ابریق" اور "آئینہ" کی ترتیب و اشاعت کا کام انہوں نے خاص دلچسپی اور اپنی شخصی نگرانی میں کیا۔ کتابت کے مرحلے کاغذ کی خریدی، ٹائیٹل کی تیاری پریس کے چکر سب انہوں نے بلا شرکت غیرے کئے اور کسی کو اس میں ہاتھ بٹانے کی اجازت نہ دی۔ جب بھی گھر والوں کی طرف سے ایسی پیش کش ہوتی تو کہتے کہ "تم لوگوں کو دس کام رہتے ہیں۔ میں ٹھہرا بے کار آدمی۔ خود ہی کرلوں گا۔ تم اپنے کام کرو اور میں اپنا کام کرتا ہوں"

ان دونوں مجموعوں کی ادبی اور علمی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ علامہ کے ایک دوست یحسن الہ آبادی نے مجھے بتایا کہ سابق شاہ ایران نے علامہ کے فارسی مجموعہ کلام "ابریق" پر اظہار خوشنودی کیا تھا اور دو ہزار روپیہ بطور انعام بھی عنایت کئے تھے۔ اسی طرح جب علامہ اپنا اردو مجموعہ کلام "آئینہ" لے کر مونظم جاہ بہادر شجیع (حضور نظام کے دوسرے صاحبزادے جو خود بھی اچھے شاعر ہیں) کے پاس پہنچے تو انہوں نے بھی اظہار خوشنودی کیا اور دو ہزار روپیہ عنایت کئے۔ اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے بھی علامہ کو "آئینہ" پر ڈیڑھ

ہزار روپیہ کا انعام دیا تھا۔ آج اردو والوں کے پاس علامہ کی شاعری کا واحد ذریعہ یہی اردو مجموعہ کلام ہے جو حیدرآباد کی تقریباً ہر لائبریری میں موجود ہے۔

آخری چند سالوں میں علامہ کی صحت ٹھیک نہیں رہنے لگی تھی۔ انھیں تبخیر معدہ کی شکایت تھی۔ پھر ضعیفی کی وجہ سے کمزوری بھی بڑھ گئی تھی۔ پھر بھی ان کے روزمرہ کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آنے پایا تھا۔ ہمیشہ ڈاکٹر سید عبدالمنان کا علاج کراتے تھے جو ان کے بہت ہی قریبی دوست تھے انھیں دیکھتے ہی ان کا آدھا مرض دور ہو جاتا تھا۔ آدھا دوا کھانے کے بعد چلا جاتا۔ مرنے سے قبل وہ "امیر خسرو کی فارسی شاعری" کے عنوان سے ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہم لوگوں (کینی احمد جلیس کے دوستوں) سے امیر خسرو کی ایک تصویر فراہم کرنے کی خواہش کی تھی۔

میرے ایک دوست شاہد عظیم نے انھیں یہ تصویر بھی فراہم کردی تھی۔ وہ شب و روز اسی کی تیاری میں لگے ہوئے تھے لیکن انتقال سے کچھ عرصہ قبل ادھر سے بھی دل اوب گیا تھا۔

علامہ کا انتقال ۱۵ فروری ۱۹۷۵ء کو ہوا۔ مرنے سے پہلے کوئی خاص بیمار نہیں تھے۔ البتہ طبیعت میں کچھ پستی پائی جاتی تھی۔ ان کا انتقال شام میں ۷ بجے ہوا۔ اس سے ایک گھنٹہ قبل بیجس الہ آبادی سے دیوان خانہ میں ملے تھے جنہوں نے مجھے بتایا کہ:

"میں ان کے انتقال سے ایک گھنٹہ قبل یہ پوچھنے گیا تھا کہ علامہ ایک دن قبل حضرت قدر عریضی کے مشاعرہ میں شرکت کرنے والے تھے پھر کیوں نہیں آئے۔ کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی

جس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہاں پرسوں سے میری طبیعت خراب ہے جگر اور متلی کی نئی بیماری کا اضافہ ہو گیا ہے۔ کل سے اب تک بے ہوشی جیسی کیفیت ہے۔ اب تو ڈاکٹر منان کے علاوہ ڈاکٹر رام پرشاد کا علاج بھی ہو رہا ہے۔"

اس کے بعد فرمایا کہ:

"کوئی اور ہوتا تو ایسی حالت میں ہرگز باہر نہ آتا لیکن چونکہ آپ نے ایک بار شکایت کی تھی کہ آپ گھر میں رہنے کے باوجود گھر والے گھر میں نہیں ہیں کہہ دیتے ہیں اسی لئے گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود آ گیا۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ انھیں متلی محسوس ہوئی۔ باہر جا کر تھوکا اور پھر آ کر بیٹھ گئے لیکن طبیعت حاضر نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ "بھئی اب تو میں اندر جاؤں گا" اور یہ کہہ کر اندر چلے گئے۔

اندر کا حال ان کی بڑی صاحبزادی عائشہ بانو نے مجھے یہ بتایا "مرنے سے چند گھنٹہ قبل بار بار بہت بے چین تھے۔ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ پھر لیٹ جاتے تھے۔ اپنے آپ میں کہتے تھے سلام علیکم آئیے تشریف رکھیے"۔ ہم لوگ پریشان ہو کر پوچھتے کہ آپ کسے سلام کر رہے تھے اور بیٹھنے کا کہہ رہے تھے یہاں تو کوئی تھا نہیں ہے تو کوئی جواب نہ دیتے"۔

مرنے سے کچھ دیر قبل پیشاب کی حاجت ہوئی۔ خود ہی اکیلے اندر گئے اور جب کمر بند باندھتے ہوئے باہر نکل رہے تھے تو لڑکھڑا گئے۔ جیلانی بانو نے دوڑ کر سہارا دینا چاہا لیکن انہوں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

اور کہا کہ وہ ٹھیک ہیں انھیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے بہر حال بڑی مشکل سے بستر پر لاکر لٹایا گیا جس کے تھوڑی دیر بعد ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آن کی آن میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ اخباروں میں یہ خبر چھپی اور لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ ظہر میں ملایا گیا اور درگاہ یوسفیین میں تدفین عمل میں آئی۔ اس درگاہ سے انھیں خاص عقیدت تھی اور زندگی میں اکثر وہاں جاتے اور فاتحہ خوانی کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کے برادر نسبتی الیاس حسین فرشوری سے زندگی ہی میں کہہ دیا تھا کہ انھیں اسی درگاہ میں دفن کرنا۔ یہ وہی درگاہ ہے جہاں داغؔ۔ امیر مینائیؔ۔ فانیؔ اور جلیلؔ آسودہ خواب ہیں۔ متعدد شعراء نے انھیں منظوم خراج عقیدت پیش کیا جو کتاب کے آخر میں شریک ہے۔

کردار کی خصوصیات

علامہ حیرت بدایونی کی شخصیت کو بلا شبہ "باقیات الصالحات" کہا جا سکتا تھا۔ وہ قدیم اور جدید نسل کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی آنکھوں نے مسلمانوں کی قدیم معاشرت دیکھی تھی اور وہ اپنی زندگی میں آخر تک قدیم اقدار کے پابند اور ان پر عمل پیرا رہے۔ وہ بے حد وضع دار تھے اور کسی قیمت پر اپنی وضع بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے سوچنے سمجھنے اور زندگی گزارنے

کا ایک خاص ڈھنگ تھا۔ اور اسی ڈھنگ کو وہ سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھتے رہے۔ انہوں نے چھوٹوں کو بھی آپ سے مخاطب کیا اور کسی کا نام بغیر صاحب کے نہیں لیا۔ میں ان کے بچوں کا ملنے والا تھا لیکن انہوں نے ہمیشہ مجھے "رشید صاحب" کہا۔ انہوں نے کبھی اپنی کبرسنی، بڑائی اور بزرگی کی کسی پر دھونس نہیں جمائی اور نہ کسی کی دل آزاری کی ـــ جہاں تک ہو سکا ہر ایک کا دل رکھا اور اس کی کمزوریوں کو درگذر کر کے اچھائیوں پر نظر کی۔

انہوں نے مشاعروں میں ہمیشہ شعراء کو دل کھول کر داد دی اور خاص طور پر نوجوان شعراء کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے کبھی کسی نوجوان سے یہ نہیں کہا کہ "میاں شاعری لوہے کے چنے ہیں کوئی اور شغل اختیار کرو"۔ بقول ڈاکٹر انور معظم "نئی اور پرانی نسل کا تعصب ان کے پاس نہیں تھا۔" اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھ سے کسی کی دل آزاری نہیں ہو سکتی میرے ایک نوجوان شاعر دوست رحمٰن جامی کے بارے میں ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ "بھئی یہ شاعر بہت اچھا ہے لیکن نئے نوشی اسے کہیں کا نہیں رکھ رہی ہے"۔ ایک بار ایک شعری محفل میں ایک بزرگ نے ایک نوجوان شاعر کی خوب لے دے کی اور اس کی غزل میں بے شمار نقائص نکالے۔ علامہ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ شاعر کی حمایت میں اکھاڑے میں کود گئے۔ دونوں بزرگوں کی خوب خوب بحث ہوئی اور ہم لوگ محظوظ ہوتے رہے۔ جب جلسہ برخاست ہوا تو علامہ کو ان بزرگ کا ہاتھ پکڑے باہر نکلتے دیکھا گیا۔ میں قریب ہی تھا۔ وہ انتہائی دوستانہ لہجے میں ان سے کہہ رہے تھے "بھئی یہ لوگ ابھی بچے ہیں

آج نہیں تو کل اچھا لکھنے لگیں گے۔ اگر ہم ہی ان کی حوصلہ افزائی نہ کریں تو پھر کون کرے گا۔"

علامہ شروع سے بے حد مذہبی تھے۔ نماز روزہ کے وہ ہمیشہ پابند رہے۔ اسی طرح تلاوت قرآن بھی روز صبح کرتے تھے۔ وہ روز علی الصبح اٹھ جاتے تھے۔ وضو کر کے بادام کا حریرہ پیتے اور نماز کے بعد قرآن شریف پڑھنے بیٹھ جاتے اور نو ساڑھے نو تک مصروف رہتے کبھی نقاہت یا بیماری کی وجہ سے تلاوت نہ کر سکتے تو بار بار یہی کہتے تھے کہ "یہ تکلیف نہیں شیطان کی مار ہے۔ آج میں نے قرآن شریف نہیں پڑھا ہے"۔ اولیاء اللہ اور بزرگان دین سے بھی انہیں خاص عقیدت تھی اور درگاہوں پر بڑے اہتمام سے جاتے اور فاتحہ دیتے تھے مولانا عبدالمقتدر بدایونی (مولانا عبدالقدیر بدایونی کے بھائی) اور ہادی القادری صاحب کے تایا کے مرید تھے۔

لیکن اس شدید مذہبیت کے باوجود ان میں کٹر پن کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ بلکہ وہ بے حد رواداد تھے اور دوسرے کے مذاہب اور عقائد کا ہمیشہ احترام کرتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن قبل میں ان کے ساتھ ان کے دیوان خانہ میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ ان کے ایک شاعر دوست آ گئے جو عیسائی مبلغ بھی تھے۔ گفتگو کا موضوع گھوم پھر کر مذہب پر آ گیا اور اسلام اور عیسائیت کے بنیادی عقائد پر بات چیت شروع ہو گئی۔ میں نے دیکھا دوران گفتگو وہ صاحب دباوجود مبلغ اور پیشہ ور واعظ ہونے کے بہت زیادہ جذباتی ہو رہے تھے لیکن علامہ نہایت سکون کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ جب مغرب کے

وقت ہوا تو بولے "آپ بیٹھیے میں ذرا نماز پڑھ لوں"۔ لیکن ان صاحب نے خود کہا کہ "علامہ میں بھی اب چلتا ہوں۔ آپ نماز کے بعد آرام فرمائیے" افسوس کہ یہ علامہ سے میری آخری ملاقات تھی۔

علامہ کو تمام فنون لطیفہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ شاعر تو وہ تھے ہی لیکن موسیقی کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ کلاسکی موسیقی سے انھیں خاص شغف تھا۔ شاہد احمد دہلوی فیروز نظامی، عبدالکریم خاں، فیاض حسین خاں، روشن آرا، جدن بائی۔ بیگم اختر، روشن علی اور ایم اے رؤف سے ان کی اچھی دوستی تھی۔ جوانی میں انہوں نے ہارمونیم اور ستار بجانا بھی سیکھا تھا۔ گانے کے لئے ان کی آواز موزوں نہیں تھی لیکن کلاسکی موسیقی کو استاد کی طرح سمجھتے تھے۔ کوئی استاد چاہے کتنا ہی مشکل راگ شروع کرے فوراً اس کی تشریح کرکے بتا دیتے تھے۔ موسیقی کے علاوہ علامہ کو دوسرے فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی تھی۔ مصوری، فوٹوگرافی، رقص، فلم اور ڈرامہ ہر چیز کو بہت پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں اور بچیوں کو کبھی ان فنون میں دلچسپی لینے اور اسے سیکھنے سے منع نہیں کیا۔ چنانچہ ان کے بڑے فرزند مونس حسن ایک بہت اچھے فوٹوگرافر ہیں چھوٹی لڑکی مہر بانو بہت اچھی مصورہ ہے۔ جیلانی بانو نے بھی افسانہ نگاری سے پہلے مصوری ہی کی طرف توجہ کی تھی۔ ان کے چھوٹے فرزند محی الدین حسن اچھے پینٹر ہیں اور احمد جلیس بہت اچھے خاکے اور کارٹون بنا لیتے ہیں۔

علامہ نے بے حد نفاست پسند طبیعت پائی تھی۔ بچپن ہی سے انھیں اپنے چاروں طرف محبت اور چاہت ملی تھی۔ چنانچہ ان کے مزاج

میں نفاست، نزاکت، خودداری اور ضد اسی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ خراب کھانا، خراب کپڑا یا کوئی بھی گھٹیا چیز کو انہوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ کھانے کا بھی وہ بے حد اچھا ذوق رکھتے اور اپنے دوستوں کی اکثر دعوتیں کرتے تھے۔ ہر کھانے کے بعد میٹھا ضرور کھاتے تھے۔۔۔ خوبصورت برتن، خوش رنگ سالن اور صاف ستھرا دسترخوان ان کے لئے ضروری تھا۔ میز پر کھانا پسند نہیں تھا۔ سب گھر والے میز کرسیوں پر بیٹھ کر کھاتے تھے لیکن وہ تخت پر اپنا الگ دسترخوان بچھاتے تھے۔ کھانا بے حد آہستہ اور تھوڑا کھاتے تھے۔ اپنے کھانے میں نوکروں کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تھے۔ ان کے ایک دوست حاجی بشیر احمد خاں نے (جو پکانے، کھانے اور کھلانے کا خاص ذوق رکھتے ہیں) مجھے بتایا کہ:

"انھیں (علامہ کو) کھانے اور کھلانے دونوں کا شوق تھا۔ ان کے گھر کے دہی بڑے، قوامہ اور سیخ کے کباب بہت خاص ہوتے تھے۔ توری کی کھچڑی بھی بہت اچھی پکاتے تھے۔ ماش کی کھچڑی اور شلجم کا اچار بھی اچھا ہوتا تھا۔ نہاری بھی عمدہ پکتی تھی۔ خود تھوڑا کھاتے لیکن دوسروں کو اصرار سے زیادہ کھلاتے۔"

علامہ بے حد گھریلو انسان تھے۔ انھیں گھر اور اس کی ہر چیز عزیز تھی ہر چند کہ انھیں بچے زیادہ تھے لیکن انھوں نے ان سے کبھی بے زاری یا لاپروائی نہیں برتی۔ انہوں نے کبھی اپنے کسی بچے کو نہیں مارا۔ بعض وقت ڈانٹ ضرور دیتے تھے لیکن پھر تھوڑی دیر بعد بات چیت شروع کر دیتے۔ جیلانی بانو نے مجھے بتایا:

"ہم سات بھائی بہن ہیں۔ اتنے بہت سے بچوں کے باوجود باوا کو اپنے ہر بچے سے بے حد محبت تھی۔ خصوصاً لڑکیوں کو وہ بہت چاہتے تھے۔ ہم آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ باوا سب سے زیادہ کس کو چاہتے تھے۔ کبھی کسی بچے کی طبیعت خراب ہو جاتی تو اماں اس کی بیماری کو باوا سے چھپاتی تھیں۔ ہم لوگ خود بھی ان کے سامنے اپنی تکلیف ظاہر نہیں کرتے تھے کیونکہ باوا کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ ساری رات جاگتے۔ کئی بار ہم اچھے ہو گئے اور وہ بیمار پڑ گئے۔"

علامہ بچوں کے علاوہ اپنی اہلیہ کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے اور ان کی خاطر داری انھیں بے حد عزیز رہتی تھی۔ ایسے مثالی جوڑے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ شاعروں کے ساتھ عام طور پر جو اسکینڈل مشہور رہتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی گھریلو زندگی تباہ ہو تی ہے علامہ اس سے مبرا تھے۔ جوانی میں بھی اس تعلق سے ان کی اہلیہ کو ان سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

علامہ کی طبیعت میں خود داری کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ ہر چند کہ انہوں نے حیدرآباد کے جاگیر دارانہ ماحول میں زندگی کا زیادہ حصہ گذارا اور سرکار دربار سے وابستہ بھی رہے لیکن اپنی خود داری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ بقول جیلانی بانو۔

"اپنی خود داری اور ضد کی وجہ سے انہوں نے نہ تو کبھی اعلیٰ ہستیوں کی شان میں قصیدے پڑھے اور نہ اونچے عہدے اور انعام و اکرام کی پروا کی۔"

علامہ کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ لیکن وہ کبھی کسی کے سامنے شکوہ سنج نہیں ہوئے اور نہ اپنے دوست احباب یا ملنے والوں کو اس کا احساس ہونے دیا کہ ان کا ہاتھ تنگ رہتا ہے۔

زندہ دلی علامہ کے کردار کا ایک نمایاں پہلو تھی۔ بقول حاجی بشیر احمد خاں "ہنستے آدمی کو رلا دیتے تھے اور روتے کو ہنسا دیتے تھے"۔ اپنے دلچسپ فقروں کی وجہ سے ہر محفل کی جان بنے رہتے تھے۔ مذاق وہ صرف فضا کو دلچسپ بنانے کے لئے کرتے تھے اس سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں تھی۔ مذاق بھی صرف ایسے لوگوں سے کرتے تھے جو انھیں عزیز ہوتے۔ پھر اسی میں بھی ایک معیار اور ثقہ پن ہوتا۔ پھکڑپن اور ضلع جگت پر وہ کبھی نہیں اترے۔

وہ شروع سے زندہ دل تھے۔ جب ۱۹۱۴ء میں دہلی امتحان دینے گئے تھے تو بعد فراغت امتحان وہاں کی اس زمانے کی مقتدر شخصیتوں سے بھی ملے جن میں حکیم اجمل خاں بھی شامل تھے۔ ان کے بارے میں خود علامہ کے الفاظ میں سنئے۔ یہ خود نوشت حالات، جو مجھے ان کے کاغذات میں ملے جو غیر مطبوعہ ہیں:-

'ماجد میاں (مولانا عبدالماجد بدایونی) نے حکیم اجمل خاں سے ملایا میں نے ان سے عربی میں گفتگو کی تو حکیم صاحب ہنس پڑے حالانکہ بہت متین تھے۔ جب بھی میں دہلی جاتا اور حکیم صاحب سے ملتا تو فرماتے عربی یاد ہے یا بھول گئے"۔

اسی سفر میں پہلی بار خواجہ حسن نظامی سے بھی ملے تھے۔ ان سے ملاقات کا حال بھی ان کے الفاظ میں سنئے:-

"امتحان کے بعد ایک روز بدھ کے دن حضرت محبوب الٰہی
بدایونی کے مزار پر گیا۔ معلوم ہوا کہ درگاہ شریف سے
چند قدم کے فاصلہ پر خواجہ صاحب بھی رہتے ہیں۔ ان کے
پاس گیا دربار جما ہوا تھا۔ میں بھی ایک طرف کو بیٹھ گیا۔
فوراً فرمایا آپ کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا سید حسن حیرت
بدایونی۔ پوچھا کہ دہلی کیوں آئے۔۔ میں نے کہا امتحان دینے
فوراً فرمایا امتحان اور شاعری حیرت کی بات ہے۔ میں نے
برجستہ کہا مگر اہل بدایون مستثنیٰ ہیں۔ خواجہ صاحب چھوٹ گئے"

حیدرآباد میں ایک بار انصاری صاحب کے مکان واقع لال ٹیکری
میں علامہ اپنے چند احباب کے ساتھ بیٹھے تھے علامہ عبدالقدیر بدایونی بھی
موجود تھے۔ ان کی تلاش میں ایک ملنگ صاحب وہاں آگئے۔ پیلے
کپڑے بڑے بڑے بال اور ہاتھ میں ایک پیچ دار ڈنڈا۔ سلام کرکے
ایک طرف بیٹھ گئے۔ علامہ کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ ان کے
ڈنڈے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "یہ کیا ہے؟ ملنگ صاحب
نے اپنے خاص انداز میں جواب دیا" تنبیہ الغافلین" یہ سن کر علامہ
نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ میں سمجھا تبض کشا ہے"۔

یہ تو تھی جوانی کی بات۔ اب بڑھاپے کا ذکر سنئے۔ بڑھاپے
میں بھی ان کی جوانی اور زندہ دلی اسی طرح برقرار تھی۔ ورنگل میں
ایک مشاعرہ تھا۔ حیدرآباد سے بھی بہت سے شعراء بشمول علامہ گئے تھے
واپسی میں سب قاضی پیٹھ اسٹیشن پر ٹرین کا انتظار کر رہے تھے
ٹرین آئی۔ مگر رش بہت زیادہ تھا۔ دروازہ میں سے داخل ہونے

کا بھی راستہ نہیں تھا۔ علامہ نے لوگوں حیدرآبادی سے کہا کہ "کیسی بھی مجھے کسی طرح ڈبہ میں سوار کرادو" انہوں نے سمجھایا کہ علامہ اس ٹرین میں رش زیادہ ہے۔ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں گے۔ ابھی دوسری ٹرین آتی ہی ہوگی اس میں چلے جائیں گے۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور فوراً اچک کر کھڑکی میں سے ڈبہ میں جا موجود ہوئے۔ یہ لوگ حیران ہو کر انھیں دیکھ ہی رہے تھے کہ ٹرین نے سیٹی دی اور علامہ اللہ حافظ اللہ حافظ کہتے ہوئے نظروں سے غائب ہو گئے۔

اسی زندہ دلی کی وجہ سے علامہ کے اطراف زندگی بھر دوستوں کا ایک ہالہ رہا جس میں اپنے زمانہ کی بے حد مقتدر شخصیتیں شامل رہیں خصوصاً جوانی میں انہوں نے بہت یار باشی کی۔ ان کے دوستوں اور ملنے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کا مسلک زندگی اور نظریات ان سے یکسر جدا تھے لیکن انہوں نے کبھی اس چیز کو اہمیت نہیں دی اور ہمیشہ یہی کہا کہ "یار کو اپنی یاری سے غرض ہے" اُردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی علامہ کے بے حد قریبی دوست تھے۔ جس زمانے میں وہ حیدرآباد میں دارالترجمہ میں ناظر تھے علامہ سے روز ملنا ملانا رہتا تھا۔ علامہ کو ان کی وسیع معلومات، عربی و فارسی پر عبور، عروض و بحر پر دسترس اور بذلہ سنجی و فقرہ بازی کی وجہ سے علامہ کا خطاب جوش صاحب ہی نے دیا تھا جو بعد میں اتنا مشہور ہوا کہ ان کا اصل نام پس پشت رہ گیا اور وہ علامہ ہی کے نام سے مشہور ہو گئے اور ان کے غائبانہ تذکرہ پر کسی کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ کون علامہ؟ جوش نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" میں

علامہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو نظم و نثر دونوں میں ہے۔ یہ دلچسپ اقتباس ذیل میں درج ہے۔

"انگلی پر لٹکے ہوئے مفلر کی طرح، دبلے پتلے اور غزل کے اس بیمار تم کی مانند نحیف و نزار، جو ہر آن کراہتا ہے کہ

اجل سمجھتی ہے مجھ کو غبار بستر کا

گورے چٹے اور بڑھاپے کے باوجود ایسا بھبو کا سارنگ رکھنے والے کہ عمر اور ریش دونوں کی درازی اس کو بھانہ سکی اور چہرے کا وہ عالم ہے کہ حضرت مسیح کے حواری معلوم ہوتے ہیں

مزاج میں اس قدر ظرافت اور شوخی ہے کہ روتوں کو ہنسا دیں اور، مدرسوں کے لڑکے ان کے روبرو اپنی چھلبل بھول جائیں، ہر چند قدیم شاعری سے وابستہ ہیں، پھر بھی نہایت آب دار شعر کہتے ہیں۔

رہنے والے ہیں بدایوں کے، جہاں کے لقا مشہور ہیں، مگر حیدر آباد دکن میں رہتے جگ بیت چکا ہے، پھر بھی زبان کی شستگی وہی ہے جو پہلے تھی اور جب دکنی اردو بولنے پر اتر آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہیں کے قدیم باشندے ہیں۔ کئی برس کی بات ہے میں حیدر آباد گیا تھا۔ انہوں نے مجھے نہاری کی دعوت کی تھی ماتی جالسی بھی میرے ہمراہ ان کے ہاں گئے تھے۔ نہاری کے واسطے جب تڑکے ان کے وہاں پہنچے اور ان کے ملاقات کے کمرے میں قدم رکھا تو اندر سے علامہ کی آواز آئی" کیا لائی ہو بیوی؟" بیوی نے کہا" وضو کے لئے گرم پانی"...

انہوں نے بڑے مزے کے ساتھ کہا "ایک زمانہ وہ تھا کہ جب مجھ پر غسل واجب ہو جاتا تھا تم میرے نہانے کے لئے پانی گرم کر کے آواز دیا کرتی تھیں کہ آؤ پانی تیار ہے۔ اور اب یہ دور آچکا ہے کہ وضو کا پانی سامنے لئے کھڑی ہو" — یہ سن کر میرا قہقہہ نکل گیا اور ان کی بیوی کی آواز آئی "بھاڑ میں جائیں ایسی بے غیرتی کی باتیں" ——— میرا قہقہہ سن کر وہ ہنستے ہوئے باہر آگئے اور زنانے کے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا "بیوی شرماتا کیوں؟ ہماری باتیں جوش صاحب کے کانوں تک نہیں پہنچی ہیں" ———

تہادی کے بعد میں نے کہا "سنو علامہ صاحب! آپ کے گھر آتے آتے موٹر میں ایک قصیدہ ہو گیا ہے، آپ کی شان میں، جس کے چند مصرے ثانی کے اور باقی اشعار ازیں خاکسار ہیں جس کے "قوافی" یہاں "وہاں" ہیں اور ردیف "ہے" "ہیں علامہ حیرت بدایونی" انہوں نے کہا "اللہ اکبر! ایسی شیطان کی آنت سی لمبی ردیف، اس دراز قامت ردیف نے اچھے شعر تو کہنے نہیں دیئے ہوں گے۔ خیر سنائیے" ——— میں نے کہا سنیئے!

مکاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
زماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

انہوں نے کہا "واللہ کمال کر دیا، میری ایک ذات میں مکان و زماں دونوں کو یکجا کر دیا ہے" ——— میں نے کہا اب شعر سنیئے:

نہایت نیک طینت ہیں، مگر حد سے سوا کچھ بد
گماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے اور کہنے لگے "بدگمان" لانا انتہائی
مشاقی کی بات ہے، میں نے کہا اور سنیئے اور سر دھنیے "جب سنا
چپ تو چپ چھپے کہو نہیں، علامہ کا لیا داں ہوا" یہ اشعار سن کر قہقہہ مارکر

میرے سینہ سے چمٹ گئے اور کہنے لگے "خدا کی قسم دنیا میں
کوئی اس ردیف کے ساتھ ایسے شعر نہیں کہہ سکتا اس قدر
مزا آیا کہ غسل واجب ہو گیا" بیوی نہانے کے لئے پانی گرم کردو

ہم بچھڑے ہوئے شاید اب کبھی نہیں مل سکیں گے اور ایک
دوسرے کو دیکھے بغیر کوچ کر جائیں گے۔
کھڑکیاں چھپ گئیں، روزن در بند ہوئے، ہم نظر بند ہوئے"
(یادوں کی برات سے)

جوش کے علاوہ اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی
جلیل مانکپوری (جنہیں بعد میں دربار آصفی سے فصاحت جنگ کا خطاب
ملا) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، رعنا صاحب مرحوم، یعقوب عثمانی
یونس سلیم، مونس ملتانی، محی الدین قادری زور، حاجی بشیر احمد خاں ہادی القادری
اور شہین ریحانی وغیرہ ان کے قریبی ملنے والوں میں شامل رہے ہیں۔
جگر صاحب انھیں ہمیشہ کہا کرتے تھے۔

"بھئی علامہ مجھے پبلک کی طرح ترنم کی داد مت دیا کرو بلکہ
اگر کہیں جھول یا فرد گذاشت فن نظر آئے تو ایمانداری سے
کہہ دیا کرو۔ میں ہٹ دھرمی نہیں کرتا۔ کیونکہ میں شاعر ہوں
استاد یا کاریگر نہیں ہوں"۔

علامہ اپنے دوستوں کی پاسداری کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے اور

انیس کے اس شعر پر عمل پیرا رہتے تھے۔

خیالِ خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

جو بھی ان سے ملنے آتا اس سے بہت اخلاق سے پیش آتے۔ ایک بار میں گیا تو ان کے ساتھ بے حس الہ آبادی اور بوگس حیدرآبادی بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "رشید صاحب ان لوگوں نے تخلص اپنے سے یکسر مختلف رکھ لئے ہیں۔ ان میں سے ایک حساس اور دوسرا چوکس ہے۔"

ادبی خدمات

نثر نگاری

علامہ حیرت بدایونی بڑے ہمہ جہتی کے بزرگ تھے۔ ان کی ایک ذات میں بہت سی صفات جمع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ وہ جہاں ایک قادرالکلام شاعر تھے وہیں ایک اچھے نثر نگار بھی تھے اور جہاں ایک اچھے نثر نگار تھے وہیں شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ حالانکہ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ایک شخصیت میں کم ہی جمع ہوتے ہیں۔ نثر ہمیشہ شاعروں کی کمزوری رہی ہے اور ادیبوں سے کبھی اسٹیج پر آکر دو لفظ بولے نہیں گئے۔ لیکن علامہ کا معاملہ دوسرا تھا۔ جب وہ کلام سنانا شروع کرتے تو ایک مکمل شاعر معلوم ہوتے۔ نثر لکھتے تو ایک صاحب طرز ادیب معلوم ہوتے اور کبھی تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو اپنی شعلہ بیانی سے محفل کو دنگ کر دیتے تھے۔

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ علامہ کا شعری مجموعہ تو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا لیکن ان کی نثری کتابیں اس سے ۲۵، ۳۰ سال قبل شائع ہو چکی تھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین بھی اس زمانے میں بیشتر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جہاں علامہ شعر بڑی آسانی سے اور چلتے پھرتے کہہ لیتے تھے وہیں نثر بہت اہتمام اور محنت سے لکھتے تھے۔ بقول جیلانی بانو

"بادا شعر جتنی جلدی لکھتے تھے نثر اتنی ہی آہستہ، کافی غور و خوض کے بعد فقرہ مکمل کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ کسی کو خط بھی لکھتے

تو پہلے سوچ لیتے کہ یہ مفہوم کن الفاظ میں ادا ہونا چاہیئے۔ اختصار اور جامعیت ان کی تحریر کی خصوصیت تھی"

علامہ کی شاعری روایتی طرز کی تھی لیکن نثر وہ جدید قسم کی لکھتے تھے۔ ان کی نثر بہت سادہ اور آسان ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنی نثر میں الفاظ کا اہتمام کیا اور نہ قوافی کا جادو جگایا بلکہ ہمیشہ بول چال کی زبان لکھی حالانکہ عربی اور فارسی پر استادانہ عبور کی وجہ سے وہ نثر میں ادق عربی فارسی الفاظ اور مترادفات استعمال کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس تصنوع سے ہمیشہ احتراز کیا اور سیدھی سادی اور جدید نثر لکھی۔ لیکن علامہ کی نثر سیدھی سادی ہونے کے باوجود روکھی پھیکی نہیں تھی بلکہ اس میں بے حد دلکشی اور تیکھا پن موجود تھا۔

علامہ نے بچوں کے لئے بھی لکھا اور بڑوں کے لئے بھی۔ مذہبی چیزیں بھی لکھیں اور ادبی چیزیں بھی۔ اپنے آخری ایام میں وہ "امیر خسرو کی فارسی شاعری" کے عنوان سے ایک نثری تصنیف کی تیاری میں مصروف تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور وہ نامکمل ہی رہ گئی۔ مجھے ان کے کاغذات میں اس کا مسودہ ملا ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بچوں کی کتابیں

علامہ کو بچوں سے شروع سے دلچسپی رہی ہے خواہ وہ ان کے ہوں یا دوسروں کے۔ گھر میں جو بھی چھوٹا بچہ ہوتا وہ اسے اپنے ساتھ کھانے میں ضرور شریک رکھتے۔ اپنے بچوں کے علاوہ نوکروں کے بچوں کو بھی

عزیز رکھتے تھے۔ جیلانی بانو نے مجھے بتایا:

"ہماری ماما کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ کام کرنے لگتی تو باوا اس کے بچے کو فرشس پر سے اٹھا کر اپنے پلنگ پر لٹا دیتے تھے۔ اس کے لئے گرم سویٹر، جھنجھنا اور دودھ کی بوتل خرید کر لاتے تھے تاکہ بچہ کی ماں کام کرے تو وہ اسے دودھ پلا کر بہلا سکیں"۔

ایک بار میں ان کے ساتھ نامپلی سے گذر رہا تھا کہ سڑک پر ایک چھوٹا بچہ روتا ہوا نظر آیا۔ علامہ فوراً رک گئے اور قریب جا کر بچے کو سمجھانے لگے۔ میں نے کہا کہ "چلئے علامہ ہوگا کوئی۔ آپ چپ ہو جائے گا" لیکن وہ نہیں مانے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ سامنے والی دھوبن کا بچہ ہے چنانچہ انگلی پکڑ کر اسے اس کی ماں کے پاس لے گئے۔ وہ کھڑی کپڑوں کو استری کر رہی تھی۔ اس نے بچہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن علامہ نے استری رکوا کر اسے بچے کو چپ کرانے کے لئے کہا اور جب وہ چپ ہو گیا تو اسی وقت آگے بڑھے۔ راستہ میں مجھ سے کہنے لگے "میاں بچے فرشتے ہیں۔ ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کوئی رنگ نہیں ہوتا کوئی ذات نہیں ہوتی"۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔

جیلانی بانو کے اکلوتے لڑکے فرحان کو وہ بے حد چاہتے تھے۔ اسے ہمیشہ آپ سے مخاطب کرتے اور اس طرح گفتگو کرتے جیسے کوئی بڑوں سے کرتا ہے۔ ایک بار میں گیا تو وہ فرحان کو اپنی ایک تازہ غزل سنا رہے تھے۔ میں نے کہا "علامہ یہ بچہ آپ کی غزل کیا سمجھے گا" بولے ارے میاں تم اسے بچہ کہتے ہو یہ تو سات بڑوں کا ایک بڑا ہے"۔ اسی طرح اپنے پوتے ڈاکٹر افضل محمد کے لڑکے افضل کو بھی بہت چاہتے تھے۔

بچوں سے اس دلچسپی نے ان سے بچوں کی کتابیں لکھوائیں۔ ویسے اس میں پبلشروں کی دلچسپی اور اصرار بھی شامل تھا۔ یہ تمام کتابیں تقسیم ہند سے قبل لکھی گئیں ان کتابوں کے دو پبلشر تھے۔ ایک دکن اردو اکیڈیمی کے مالک قمر فریدی اور دوسرے عبدالحق اکیڈیمی کے مالک شبر حائمی۔ علامہ نے بچوں کے لئے کوئی نصف درجن سے زیادہ کتابیں لکھیں جن کے نام یہ ہیں۔

جیل خانہ، پاگل خانہ، خواجہ معین الدین، خواجہ نظام الدین
ترقی معکوس، جنگل کانفرنس اور شہسوار

ان میں دو کتابیں خواجہ معین الدین اور خواجہ نظام الدین مذہبی نوعیت کی ہیں اور ہندوستان کے دو مشہور اولیاء خواجہ معین الدین چشتی (اجمیر) اور خواجہ نظام الدین اولیاء (دہلی) کے حالات زندگی پر آسان زبان میں لکھی گئی ہیں تاکہ مسلمان بچوں کی کردار سازی میں مدد مل سکے۔ جیل خانہ اور پاگل خانہ بچوں کی دلچسپی کے لئے لکھی گئی اور مزاح کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ ترقی معکوس ہیں۔ بچوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جنگل کانفرنس ایک رمزیاتی کتاب ہے جس میں جنگل کے جانوروں کے روپ میں انسانی زندگی کی تمثیل پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اس کے ناشر لکھتے ہیں

"علامہ حیرت بدایونی نے جس انداز میں "جنگل کانفرنس" کو ترتیب دیا ہے اور جس مخصوص اور انفرادی اسلوب نگارش سے کام لے کر موجودہ سائنس بچوں کے ذہن نشین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ہمیں یقین ہے کہ دنیائے ادب میں اس سے

ایک انقلاب آفرین افسانہ ہوگا۔ زبان جیسی آسان اور فصیح و بلیغ استعمال کی گئی ہے اس کی داد نہ دینا بھی جو دنادوا کا مترادف ہے۔ ہم مصنفین اور ناشرین دونوں اس افسانہ میں غور و فکر کی دعوتیں مستور پاتے ہیں۔ مضمون میں "سرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں" کا جو لطیف طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی تحسین اہل نظر ہی کر سکیں گے"۔

"شہسوار" میں علامہ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے کہ بچے کو شروع سے زندگی کی جدوجہد کے لئے تیار کرنا چاہئیے اور اسے اپنے میدان کا خود انتخاب کرنے کی آزادی دینی چاہئیے۔ اپنی عملی زندگی میں بھی وہ اسی اصول پر کاربند تھے اور اپنے بچوں کی تربیت بھی انہوں نے اسی طرح کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جیلانی لکھتی ہیں:

"بابا نے اپنی کوئی بات کبھی ہم سے جبراً نہیں منوائی۔ وہ بچپن سے ہمارے دوست تھے۔ آخر تک دوست ہی رہے ہم تعلیم کی کونسی لائن اختیار کر رہے ہیں کیا مضامین لے رہے ہیں۔ اس بارے میں انہوں نے کبھی دلچسپی نہیں لی بلکہ سب ہم پر چھوڑ دیا"۔

"شہسوار" نامی ان کی بچوں کے لئے لکھی گئی چھوٹی سی کتاب کا موضوع بھی یہی ہے۔ علامہ نے بچوں کے لئے روایتی طرزِ تحریر اختیار کیا اور نہ گھسے پٹے موضوع چنے بلکہ ہمیشہ جدید طریقہ پر نئے قصے کہانیاں بیان کیں اور باتوں باتوں میں کام کی باتیں بتائیں۔ چنانچہ "شہسوار" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"وہ کس رنگ کا تھا گھوڑا ؟"

جی سبزہ تھا مگر بہت موٹا تازہ

ہاں تو کہے جاؤ۔ اس نے گویا تمہیں بہت ستایا

جی کیا عرض کروں زندگی سے بیزار کر دیا۔

"ابا جان کا یہ حکم کہ گھوڑ دوڑ میں شریک ہونا ہی پڑیگا میری یہ حالت کہ میں کمزور اور کم عمر۔ گھوڑے کا یہ عالم کہ بلا کا اڑیل، منہ زور۔ قریب نہ آنے دے۔ آدمی کو دور سے دیکھا اور دولتیاں پھینکنی شروع کر دیں۔ ذرا کسی نے ہاتھ لگایا اور وہ الف ہو گیا۔ بے حد شریر۔ بڑے سے بڑے شہسوار و خاطر میں نہ لائے۔ یہی چاہتا تھا کہ بندھا بندھا تھان پر کھائے۔ کام سے بُجّر آتا تھا۔ میں بے چارہ کس شمار قطار میں تھا۔ جو وہ مجھ سے دبتا۔"

اور اس کتاب کا اختتام اس طرح سے ہوتا ہے:۔

"بہت مبارک خواب ہے۔ تمہاری اور گھوڑے کی لگاوٹ حقیقت میں دماغ اور دل کی جنگ تھی جس میں دل پر تم نے قابو پالیا۔ یہ سب تمہارے والد کا منصوبہ تھا جس کو پورا ہوتے وہ نہ دیکھ سکے۔ ان کی روح بے چین ہے اور بے چین رہے گی۔ جیسے ہی قدرت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ تمہیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھاتے اور زندگی کی دوڑ میں تمہیں پیش پیش دیکھ کر خوش ہوتے۔ اب ان کی روح نے بے چین ہو کر تمہیں خواب میں سب کچھ دکھا دیا

اور سمجھا دیا۔ آگے تمہیں اختیار ہے ؎

ہم نہیں کہتے کہ تم یہ نہیں وہ کام کرد
مصلحت دیکھ کے ہر کام سرانجام کرد"

ان دونوں اقتباسات سے جہاں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ علامہ بچوں کے لئے کیسی زبان استعمال کرتے تھے بلکہ اس بات کا بھی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ بچوں کے لئے کن موضوعات کا انتخاب کرتے تھے۔ افسوس کہ تقسیم ہند کے بعد انھوں نے بچوں کے لئے کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ کسی نے ان سے اصرار کرکے لکھوایا۔ حتیٰ کہ بچوں کے رسالوں میں اس کے بعد ان کے کوئی مضامین یا کہانیاں نظر سے نہیں گزریں حالانکہ ان کی صاحبزادی جیلانی بانو پابندی سے بچوں کے رسالہ "کھلونا" (دہلی) کے لئے لکھتی ہیں۔

لیڈیز فرسٹ

یہ کتاب ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی اور شائع ہوئی ہے۔ یہ اس مخصوص دور کی یادگار اور عکاس ہے جب کہ تقسیم کے بعد ریاست حیدرآباد ایک سال تک آزاد تھی اور یہاں رضاکار تحریک اپنے عروج پر تھی۔ یہ فضا انتہائی مسموم اور کشیدہ تھی اور اچھوں کے ذہنوں پر فرقہ واریت سوار تھی۔ حیدرآباد کے ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی زمانہ میں ابراہیم جلیس نے "دو ملک ایک کہانی" اور "ترنگے کی چھاؤں میں" جیسی چیزیں لکھیں۔ چونکہ ادب زندگی کا آئنہ

ہوتا ہے۔ اور ادیب اسی سماج کا فرد ہوتا ہے اس لئے ان حالات سے اس کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں "مقدمہ شعروشاعری" میں حالی نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ "ادب سوسائٹی کو اتنا خراب نہیں کرتا جتنا سوسائٹی ادب کو کرتی ہے"۔

چنانچہ علامہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے "لیڈر پرست" جیسی کتاب لکھی جس میں شدید فرقہ واریت ملتی ہے اس کا دیباچہ لندن کا لیڈر اور صدر مجلس اتحاد المسلمین سید قاسم رضوی نے لکھا تھا ہر چند کہ یہ کتاب ایک غیر صحت مند موضوع پر لکھی گئی تھی لیکن اس میں علامہ کی نثر اپنی بہار پر ہے۔ پھر بھی چونکہ یہ ہنگامی ادب کے زمرہ میں آتی ہے اس لئے ادب یا علامہ کے کریر میں اس کا کوئی مقام نہیں ہو سکتا اور اس کا تفصیلی ذکر بھی مناسب نہیں۔

متفرق مضامین

علامہ کے متفرق مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اس زمانے کے ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں سے بہت کم کی کاپیاں ان کے پاس موجود تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر مضامین شاعروں اور ادیبوں کے انتقال کے موقع پر لکھے گئے اور تعزیتی جلسوں میں پڑھے گئے جن کی اشاعت کی بعد میں نوبت نہیں آئی۔ بعض مضامین ریڈیو کے لئے لکھے گئے۔ ایسے مضامین بھی شائع نہیں ہوئے اور ان کے مسودات ان کے کاغذات میں محفوظ ہیں۔

ان مطبوعہ مضامین میں "حضرت جلیل کا فنی مقام" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ ماہنامہ "ایوان" حیدرآباد کے فروری ۱۹۴۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا اور اس میں ان کو علامہ کی بجائے مولانا لکھا گیا تھا۔ مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"کلام جلیل کے بلاغتی عنصر پر نقد اور اس کے صنائع بدائع پر کسی اصولی تبصرہ سے قبل ضروری ہے کہ مبادی کے طور پر چند اصولی امور معین کر دیئے جائیں جن کی اساس پر نقد و نظر کی کوشش کی جاسکے۔ جن امور کا تعین مقصود ہے ان میں دو امور بہت اہم ہیں۔

۱۔ ناقد کے زاویہ انتقاد کا تعین

۲۔ شاعر کے مکتب خیال کا تعین

ان دو کے علاوہ باقی جتنے امور ہیں وہ ضمنی درجہ رکھتے ہیں اور خود بحث میں آجائیں گے۔"

مضمون کا اختتام اس طرح عمل میں آتا ہے

"میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اصول و حقائق اور وجوہ دلائل کی روشنی میں جلیل مرحوم کے فنی نظام کو اس مضمون میں پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے اس میں طرفداری یا تعلقات شخصی کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ کیوں کہ ایک شاعر کی حیثیت سے میں خود حضرت جلیل کے اسکول یا کسی دوسرے اسکول سے مربوط اور متعلق نہیں ہوں لیکن ایک انصاف پسند ناقد کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں شاعر مرحوم کے کلام پر ان ہی کے مکتب خیال کے حدود

میں رہ کر انتقاد کروں؟

اس مضمون کی اہمیت ہمارے پاس اس لئے بھی زیادہ ہے کہ اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ علامہ کا نظریہ شعر کیا ہے اور ان کے پاس اچھے شعر کی خصوصیات کیا تھیں۔ چنانچہ جلیل کے اوصاف شاعری گناتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"میں نے ان کی تمام تصنیفات اور سب کلام دیکھا ہے۔ محاورے معنوی استفادہ اور الفاظ متناسبہ کے انتخاب سے مراعات النظیر کی صنعت پیدا کرنا ان کی خصوصیات بیان سے ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی کثرت کے ساتھ بے ضابطگی و برجستگی ان کا حصہ تھا۔ بسا اوقات فصاحت کی رو اور روانی کے کیف میں محاسن معنوی تک نظر بھی نہیں جاتی تشبیہ و استعارہ کے علاوہ دیگر صنائع و بدائع کی بھی جلیل کے پاس کمی نہیں۔ تقابل تجنید، ایہام، حسن تعلیل، لف و نشر وغیرہ بھی ان کے یہاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔"

فانی بدایونی صرف ان کے اہم وطن ہی نہیں تھے بلکہ ان سے علامہ کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ فانی کے آخری چند سال حیدرآباد ہی میں گذرے اور وہ اسی خاک کے پیوند ہیں۔ اس زمانے میں علامہ سے ان کا روز کا ملنا تھا۔ مکانات بھی بالکل قریب قریب تھے۔ مہاراجہ کے دربار میں بھی دونوں کا ساتھ رہا۔ ان کے انتقال کا علامہ کو جتنا قلق ہوا وہ پھر کسی اور کو نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے ان سے اصرار بھی کیا تو وہ فانی پر کچھ نہ لکھ سکے۔ لیکن جب ان کے انتقال کو کئی سال گذر گئے تو ان کی برسی کے موقعہ پر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد

نے علامہ سے فانی پر ایک مضمون لکھوایا۔ یہ نشری تقریر مجھے ان کے کاغذات میں ملی ہے۔ لکھتے ہیں :

آج یوم وصال فانی ہے

موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

عجیب اتفاق ہے کہ آج کی تاریخ یعنی ۲۶ر اگست کو فانی کی تاریخ انتقال ہے اور آج ہی آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے فانی بدایونی کے متعلق میں یہ تقریر بھی نشر کر رہا ہوں۔ آج ہی کا دن وہ دن تھا جب فانی کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی کہ ؎

ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانیؔ
جس دن مجھے مرنے کی تمنا نہ رہے گی

آخر کار ۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء کو وہ دن آہی گیا جس دن ان کو مرنے کی تمنا نہیں رہی اور دکن کی خاک ان کے چہرہ کا غازہ بنی۔ وہ اپنی زندگی کے متعلق بھی اپنی زندگی میں کہا کرتے تھے۔ ؎

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

داغؔ، امیر اور جلیل نے بھی وطن چھوڑا تھا۔ دکن کی خاک ان کے چہرہ کا بھی غازہ بنی تھی مگر غربت ان کو راس آ گئی۔ شاہانہ قدردانیوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ لیکن فانی کو دکن کی خاک ہی کھینچ کر لائی تھی۔ ناکامی اور نامرادی ان کا مقدر تھی۔ دکن گیا اور وطن گیا۔ حرماں نصیبی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اپنے وطن سے بھی زندگی بھر نالاں رہے۔ وہاں بھی ان کو سکون نہیں ملا۔

زمین حشر فانی کیا قیامت ہے معاذ اللہ
مجھے اپنے وطن کی سی زمین معلوم ہوتی ہے"

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے بھی علامہ کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ زور صاحب ان سے بہت چھوٹے تھے۔ لیکن ان کا انتقال پہلے ہوگیا۔ جب ایوان اردو میں منعقدہ تعزیتی جلسہ میں علامہ نے زور صاحب پر مضمون پڑھا تو کوئی سی آنکھ تھی جو نم نہیں ہوئی۔ بعد میں یہ مضمون ماہنامہ "سب رس" کے زور نمبر میں بھی شائع ہوا۔ اسی مضمون میں سے ایک اقتباس پیش ہے:

"آج ایوان اردو بھی ہے اور ادارہ ادبیات اردو بھی کتب خانہ بھی ہے اور دار المطالعہ بھی۔ ماہنامہ "سب رس" بھی ہے اور دیگر تمام تصنیفات بھی۔ ابو الکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی ہے اور اس کی ریسرچ کا کام کرنے والے بھی۔ اردو ادب کے نظم و نثر اور نقد و نظر کی ساری تخلیقات بھی ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو تیس پینتیس برس کی ہمہ وقتی جد و جہد میں مہیا کیا گیا۔ یہ تمام تر حقائق نہایت آرائش و زیبائش کے ساتھ ایک سجی سجائی آراستہ و پیراستہ برات کی شکل میں ہم سب کے سامنے موجود ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اس برات کا دولہا کہاں ہے۔ ایوان اردو کا معمار کہاں چھپ گیا۔ ادارہ ادبیات اردو کا بانی کہاں چلا گیا۔ کتب خانہ اور دار المطالعہ کا موسس کیوں غائب ہے۔ "سب رس" کا مدیر، تنقیدی و تاریخی کتابوں کا ناقد، مولف و شاعر کیا ہوگیا"۔

جب میر عثمان علی خاں کا انتقال ہوا تو وہ انھیں خراج عقیدت پیش کئے بنا نہ رہ سکے۔ چنانچہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں شائع شدہ ان کے مضمون "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے" کا ایک اقتباس پیش ہے۔

"چھ بادشاہ صدیوں میں جو نہ کر سکے وہ ساتویں بادشاہ نے ۳۷ سال کی حکمرانی میں کر دکھایا۔ تخت پر بیٹھتے ہی ایک ہی دھن لگ گئی حیدرآباد کو زمین سے آسمان پہ پہنچا دوں۔ ہندوستان کے ہر پایہ تخت سے آگے بڑھا دوں۔ زمین کی جنت بنا دوں اور حیدرآبادیوں کے دل میں ایسی لو لگا دوں کہ......... مشرق مغرب والے بھی حیران رہ جائیں کہ حیدرآباد کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ آدمی کوئی بات جی پر رکھ لے تو کیا نہیں کر سکتا۔ نیت نیک تھی عزم محکم تھا۔ اب کیا تھا جہد مسلسل میں لگ گئے۔ کہاں کے لباس فاخرہ و خلعت سلطانی۔ کیسا شاہانہ دربار و طمطراق خسروی کس کی شان و شوکت و عظمت و سطوت، اللہ کا دیا لاؤ لشکر بھی تھا۔ خدم و حشم بھی تھے۔ دولت و ثروت بھی تھی اقتدار و حکومت بھی تھی۔ سکہ بھی اپنا تھا ڈاک بھی اپنی تھی ریل بھی اپنی تھی۔ اور پھر سب سے بڑھ کر رعیت بھی ایسی وفادار تھی کہ جہاں سرکار کے غلاموں کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہا دیں۔ اب کیا تھا سارے تماشے ٹھاٹ باٹ چھوڑ جٹ گئے ملک کی ترقی میں"۔

علامہ نے چیدہ چیدہ مضامین بہت لکھے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے

کہ ان سارے مضامین کے نہ تو مسودے محفوظ ہیں اور نہ ان کی مطبوعہ کاپیاں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مضامین کو ڈھونڈھا کر اور یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ یہ کام ان کے فرزندوں کا ہے کہ وہ اس جانب توجہ کریں۔

امیر خسرو کی فارسی شاعری

علامہ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے لیکن انہوں نے نثر بھی بہت زیادہ لکھی ہے اور نثر میں چیدہ چیدہ مطبوعہ مضامین کے علاوہ ان کی مستقل تصانیف بھی ملتی ہیں۔ اپنے انتقال سے قبل بھی وہ ایک نثر کی کتاب کی تالیف میں مصروف تھے جس کا عنوان تھا "امیر خسرو کی فارسی شاعری"۔ جب ہندوستان میں شاندار پیمانہ پر امیر خسرو کی سات سو سالگرہ تقاریب منائی گئیں تو علامہ کو بھی خیال ہوا کہ ان پر کچھ لکھنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا۔ ان کے کاغذات میں مجھے اس کتاب کا مسودہ ملا ہے۔ افسوس کہ وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو خسرویات میں ایک اچھا اضافہ ہوتی۔

علامہ نے اس کتاب کی ابتداء بہت تیزی سے کی تھی لیکن بعد میں وہ اسے اسی تیزی سے مکمل نہ کر سکے۔ اس کی وجہ ان کی صحت رہی ہے۔ آخری ایام میں وہ بہت زیادہ کمزوری اور پستی محسوس کرنے لگے تھے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ صرف پلنگ پر لیٹے

رہتے تھے۔ ان کے گھر والوں نے کئی بار توجہ بھی دلائی کہ کتاب مکمل کر لی جائے۔ اس طرح کچھ دل بھی بہل جائے گا لیکن ان کی طبیعت کسی طرح راغب نہ ہوئی۔ مجھ سے بھی انہوں نے اس کتاب کی تالیف کا تذکرہ کیا تھا۔ چنانچہ ایک دن میں نے پوچھا:

"علامہ وہ امیر خسرو کی کتاب کا کیا بنا؟"

"ہاں چل رہی ہے" انہوں نے بے دلی سے جواب دیا۔

"اگر وہ جلد مکمل ہو جائے تو اچھا رہے گا" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا

"رشید صاحب ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے" علامہ نے جواب دیا۔

انہوں نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ میں اس موضوع کو آگے نہ بڑھا سکا۔

اب جو اس کتاب کا مسودہ ان کے کاغذات میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تو میں نے دل میں سوچا کاش یہ کتاب مکمل ہو جاتی۔ لیکن پھر علامہ کا جملہ یاد آ گیا کہ ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ شائد اس کتاب کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ نامکمل رہ جائے

اس کتاب کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

آج سنو حیرت کی زبانی ۔۔ دہلی کے خسرو کی کہانی

امیر احمد امیر خسرو

ترکی الاصل و النسل تھے۔ ترکمان ہونے پر فخر بھی کرتے تھے۔

پشتہا پشت سے پیشہ آباو اجداد سپہ گری تھا اور شاعری بھی

مایہ صد افتخار تھی۔ وہ نہ کوئی جن تھے نہ فرشتہ۔ نہ پیمبر نہ جادوگر۔ نہ کوئی تاجدار نہ راجہ و راجکمار۔ نہ کوئی رشی منی نہ کوئی اوتار۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پٹیالی گاؤں کے ایک گنوار یا پھر اپنے پیارے محبوب کے جیتے جاگتے چمتکار" امیر خسرو کے وطن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"قصبہ پٹیالی سالہا سال سے یوپی کے ضلع ایٹہ میں شمار کیا جاتا ہے مگر مشہور ہے کہ اگلے وقتوں میں ضلع قنوج کا قصبہ تھا۔ بعض لوگ خسرو کو قنوجی بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ قنوج اور ایٹہ یہ دونوں اضلاع باہم متصل واقع ہوئے ہیں۔ ممکن ہے پٹیالی کسی زمانے میں قنوج ہی کا ضلع رہا ہو یا پھر امیر و زمیندار ہونے کے سبب خسرو کے بزرگان خاندان قنوج ہی میں رہتے ہوں اور اپنی جاگیر پٹیالی بھی آتے جاتے ہوں۔ بہر حال پٹیالی اور دہلی کے درمیان تقریباً سو میل سے بھی کم مسافت ہے۔ درمیان میں صرف علی گڑھ ہے۔ اس لئے خسرو کے خاندان نے پٹیالی چھوڑ کر دارالسلطنت دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی اور پٹیالوی سے دہلوی ہو گئے"

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے امیر خسرو کی عقیدت کے بارے میں علامہ لکھتے ہیں:

"جس زمانہ میں خسرو دہلی آئے وہی زمانہ تھا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کا جو بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر اور اولوالعزم خلفاء میں سے تھے۔

پس حضرت محبوب الٰہی کی نگاہ انتخاب نے خسرو کو اپنالیا اور خسرو
آخر کار محبوب پاک پہ پروانہ وار فدا ہو گئے۔ محبت کے جال میں
ایسے پھنسے کہ جیتے جی تڑپتے ہی رہے۔ دل میں دل لگایا تو محبوب
الٰہی سے۔ بقول شاعر ؎

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود

اب کیا تھا بقول کسے ؎

دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی

اس آگ نے شاعر کو ساحر بنا دیا۔ کشتہ کیمیا ہو گیا۔ پٹیالی کا
قصباتی جوان دار الخلافہ دہلی کا طوطی ہندوستان بن گیا۔
خسرو کی عزت و شہرت کو چار چاند لگ گئے۔"

اس کتاب میں علامہ نے خسرو کی فارسی شاعری سے بحث کی ہے
اور ساتھ ہی ساتھ کلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے نثر میں اس کا ترجمہ
بھی کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"خسرو کا فارسی کلام آپ نے بہت سنا ہوگا بلکہ بہت سے اشعار اور
غزلیں زبانی بھی یاد ہوں گی۔ مگر اہم غزلیات میں شاید کبھی نہ سنی ہوں گی۔"

علامہ کے انتقال کی وجہ سے یہ کتاب درمیان ہی میں ختم ہو گئی اس
لئے یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ کتنے صفحات پر اسے محیط کرنے والے تھے
اور اس میں مزید کیا کیا چیزیں شامل کرنے والے تھے اور اسے کس طرح
ختم کرنے والے تھے۔

صحافت

ادب کے ساتھ ساتھ علامہ کا تعلق صحافت

سے بھی رہا ہے۔ انہوں نے دو رسالوں کی ادارت کی اور دو اخباروں میں مزاحیہ کالم لکھے۔ ہر چند کہ یہ میدان علامہ کا نہیں تھا۔ اور اس سے وہ زیادہ دن وابستہ نہیں رہے لیکن ان کے کیریر سے صحافت کو یکسر خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چیدہ چیدہ طور پر انہوں نے بہت سے اخبارات میں مضامین بھی لکھے ہیں۔ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے وہ آخیر تک مستقل مضمون نگاروں میں شامل رہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب عابد علی خاں سے ان کے ذاتی اور دوستانہ مراسم تھے اور ان کا مجموعہ کلام "آئینہ" عابد علی خاں صاحب کی دلچسپی ہی کی وجہ سے شائع ہوا تھا جس کا اعتراف علامہ نے اس کے دیباچہ میں کیا ہے:

"شروع سے ہی میرا ارادہ دیوان مرتب کر کے شائع کرنے کا نہیں تھا مگر میر عابد علی خاں صاحب مدیر "سیاست" نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں پرزے، پرچے، چھوٹی موٹی کاپیاں گھر میں تلاش کر کے جمع کروں اور ان سے مجموعہ مرتب کروں۔ جبراً قہراً بہ نہایت تکلیف وہ کام مجھے کرنا پڑا۔"

اخباروں سے علامہ کو شروع سے دلچسپی رہی ہے۔ جو بھی شخص سیاست سے دلچسپی رکھے گا اسے اخبار سے دلچسپی لینا ضروری ہے۔ چونکہ علامہ اوائل جوانی سے خلافت تحریک سے وابستہ تھے اس لئے انھیں اس زمانے سے ہی اخبارات سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جو آخیر عمر تک باقی رہی ان کے پاس "سیاست" آتا تھا۔ وہ بہت جلد بیدار ہو جاتے تھے اور فجر کی نماز پڑھ کر اخبار کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ اکثر دفعہ اخبار کے انتظار میں بے چینی سے گھر کے سامنے ٹہلا کرتے تھے۔ جوں ہی اخبار آتا

اسے شروع سے آخر تک پڑھتے تھے۔ مقامی خبروں کا صفحہ خاص دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ جس دن بھی اخباروں میں کسی شناسا کے انتقال کی خبر ہوتی یہ آواز بلند الحمد للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے۔ اس طرح ان کے گھر والوں کے اٹھتے تک علامہ مقامی اور بیرونی حالات سے پوری حد تک واقف ہو جاتے تھے اور خبروں کے بارے میں گھر والوں سے تبادلہ خیال بھی کرتے تھے۔

رسالہ "شمس العلوم" بدایون کی ادارت

علامہ کی صحافتی زندگی کا آغاز رسالہ شمس العلوم' بدایون کی ادارت سے ہوتا ہے۔ شمس العلوم بدایوں کی وہ درسگاہ تھی جہاں علامہ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس درسگاہ سے اس نام کا ایک رسالہ بھی نکلتا تھا جو ایک دینی رسالہ تھا۔ پہلے اس کے ایڈیٹر عبدالماجد بدایونی تھے جو علامہ کے استاد بھی تھے اور ساتھی بھی خیر خواہ بھی تھے اور دوست بھی۔ انھوں نے اس رسالہ کے لئے علامہ سے بہت سا نظم کی نثر کی چیزیں لکھوائیں۔ علامہ میں تقریر کا شوق بھی ان ہی صاحب نے پیدا کرایا۔ یہ صاحب بے حد خوبیوں کے مالک تھے اور ایک مخلص و پرجوش کارکن تھے۔ بدایون میں خلافت تحریک کے روح رواں بھی تھے لیکن افسوس کہ ان کا انتقال سانپ کے کاٹنے سے عین جوانی میں ہو گیا۔ ان کا ذکر "حیات" کے باب میں آچکا ہے۔

علامہ کو عبدالماجد بدایونی کے انتقال کا بے حد قلق ہوا۔

ابھی وہ حواس میں بھی نہیں آئے تھے کہ منتظمین مدرسہ نے رسالہ "شمس العلوم" کی ادارت کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال دیا۔ علامہ نے اپنے استاد، کرم فرما اور دوست کی روایتوں کو بہ حسن وخوبی آگے بڑھایا اور بڑی محنت اور لگن کے ساتھ پرچہ مرتب کرتے رہے۔ یہ ایک مذہبی رسالہ تھا اور اس میں اکثر دینی و علمی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ علامہ کی مذہبی شاعری کا ابتدائی حصہ اسی رسالہ میں شائع ہوا ہے۔

علامہ جب تک بدایوں میں رہے رسالہ "شمس العلوم" کی ادارت سنبھالے رہے لیکن جب وہ کانپور منتقل ہو گئے تو اس کی ادارت سے بھی دستبردار ہو گئے لیکن ان کی مذہبی چیزیں اس میں برابر چھپتی رہیں۔ اس طرح علامہ کی صحافتی زندگی کا پہلا تجربہ رسالہ "شمس العلوم" کی ایڈیٹری تھی۔ ان کی صحافت کا یہ دور کوئی ۵ سال کے عرصہ پر محیط ہے۔

رسالہ "چراغ" حیدرآباد کی ادارت

ماہنامہ "چراغ" حیدرآباد علامہ کا اپنا ذاتی رسالہ تھا جو انہوں نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۵۲ء میں نکالا تھا۔ یہ ایک ادبی رسالہ تھا اور اس کے صرف چند شمارے شائع ہوئے۔ اس کا دفتر لال ٹیکری میں علامہ کے دوست انصاری صاحب کے مکان میں تھا۔ اپنے بچپن میں میں نے بھی یاد ہا سڑک سے گذرتے ہوئے یہ بورڈ دیکھا

تھا۔ "چراغ" کے معاونین میں جیلانی بانو اور سری نواس لاہوٹی کے نام شامل تھے۔ اردو ادب کو "چراغ" کی سب سے بڑی دین جیلانی بانو ہیا۔ بانو نے اسی رسالہ سے لکھنا شروع کیا۔

"چراغ" میں علامہ کی غزلیں اور مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ ایک شمارہ میں ان کی ایک نظم "بسنت" میری نظر سے گذری ہے جو ذیل میں درج ہے:

رت بسنت مدھ ماتی آئی — آئی پھول کھلاتی آئی
سرسوں پھولی گیندا پھولا — پنچھی پیڑ پہ جھولا جھولا

بگیا میں سب پنچھی آئے — روگی بھاگے راگی آئے
گیت بہار کے گاتی آئی — رت بسنت مدھ ماتی آئی

بھونرا پھولوں کے منہ چومے — رس چوسے رس پی کر جھومے
جگ میں پھول کھلاتی آئی — رت بسنت مدھ ماتی آئی

پی پی کے گن گائے پپیہا — دھوم مچائے چڑیا چڑیا
جوبن پر اتراتی آئی — رت بسنت مدھ ماتی آئی

رنگ میں جیرت تم بھی نہاؤ — ایک ہی رنگ میں رنگ جاؤ
نت نئے رنگ دکھلاتی آئی — رت بسنت مدھ ماتی آئی

چند شماروں کے بعد "چراغ" کی اشاعت مسدود ہو گئی۔ یہ

ایک ادبی رسالہ تھا۔ نیا نیا نکلا تھا اس لئے خریدار زیادہ نہ تھے۔ پھر اس میں کچھ اشتہارات بھی نہیں ہوتے تھے۔ سب سے بڑھکر کسی رسالہ کو معاشی بنیادوں پر مستحکم کرنے کے لئے جس بخبر ادبی مزاج کی ضرورت ہوتی ہے وہ علامہ کے پاس نہیں تھا اس لئے "چراغ" بہت جلد بجھ گیا۔

اخبارات میں کالم نگاری

علامہ نے حیدر آباد کے دو اخبارات "پیام" اور "عوام" میں مزاحیہ کالم بھی لکھے ہیں۔ پہلا اخبار قاضی عبدالغفار کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور حیدر آباد کا ایک کثیر الاشاعت و سنجیدہ روزنامہ تھا۔ یہ پولیس ایکشن سے پہلے نکلتا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد اسی اخبار کو نام بدل کر "عوام" کے نام سے اختر حسن صاحب نے نکالا۔

"پیام" میں کالم نگاری علامہ نے شوقیہ اور قاضی عبدالغفار کے اصرار پر کی تھی جبکہ "عوام" میں انہوں نے ضرورتاً اسے اختیار کیا۔ کیوں کہ پولیس ایکشن کے بعد وہ قبل از وقت ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے اور ان کے ذرائع آمدنی بالکل محدود ہو گئے تھے جب کہ ان کے گھر کا خرچ بہت بڑھ چکا تھا اور تمام بچے بڑے ہو گئے تھے لیکن سب طالب علم تھے اور کمانے کے قابل کوئی نہ تھا۔ مجھے اسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں ان اخبارات کی پرانی فائلیں

دیکھنے کا اتفاق ہوا اور علامہ کے لکھے ہوئے بعض کالم بھی میری نظر سے گذرے۔ اس کالم کا عنوان 'سرِ راہ' تھا اور علامہ راہ رو کے عنوان سے اسے لکھتے تھے۔ ان کالموں میں عام طور پر مزاحیہ انداز میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوتا تھا۔ بعض دفعہ کوئی ادبی چٹخارہ کی چیز بھی شائع ہو جاتی تھی کبھی کبھی وہ مزاحیہ انداز میں کوئی قطعہ یا غزل بھی لکھ دیتے تھے۔ مثلاً 'پیام' کے ایک کالم میں ان کی یہ مزاحیہ غزل شائع ہوئی تھی ؎

آپ کی زلفوں نے دی اپنی پریشانی مجھے
آپ کی آنکھوں نے بخشی اپنی حیرانی مجھے
اب نہ ملنے کا تو میں نے کر لیا تھا فیصلہ
ڈال کر باہیں گلے میں کر دیا پانی مجھے
والدہ تو آپ کی خاموش رہتی ہیں مگر
کہتی ہے ہر وقت بڑھیا آپ کی نانی مجھے
چائے پانی کی جو دعوت ہو تو ملتا ہی نہیں
خود بھی جاتا ہوں جہاں ملتی ہے بریانی مجھے
لوگ کہتے ہیں مرے چہرے پہ ہے کالا نمک
شمعِ محفل جانتی ہے میری پروانی مجھے

ایک اقتباس نثر کا بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ میں نے 'عوام' کے کالم سے لیا ہے

آج کل ہماری نمائش میں سرکاری محکمہ جنگلات شہد بھی فروخت کر رہا ہے میری جو شامت آئی تو میں نے آدھ سیر کی ایک چھوٹی بوتل چار روپیہ میں محکمہ جنگلات کے اسٹال سے خریدلی۔ اب جو گھر آکر شہد کھایا تو ایک نیا انکشاف ہوا کہ ماشاءاللہ سے شہد ترش یعنی کھٹا

بھی ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لیمو، کرنا، کیری، انار اور املی وغیرہ کے پھولوں پر مکھیوں کو بھیج کر محکمہ جنگلات نے شہد جمع کیا ہے اور سب سے پہلے نمائش میں اس کو فروخت کیا جا رہا ہے تاکہ لوگ ایمانداری کے ساتھ اس شہد کو چاٹ جائیں میں شہد کے شوقین منچلوں سے کہتا ہوں کہ وہ جھوٹے مقدمات کی اشلہ کو بھی شہد لگا کر چاٹیں تو زیادہ مناسب ہے۔ محکمہ صنعت و حرفت کو بھی محکمہ جنگلات سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ عہدہ داروں کی توجہ خاص سے ہمارے محکمے کیسی ترقی کر رہے ہیں۔ ترقی زندہ باد۔

اس کے ساتھ ہی علامہ حیرت بدایونی کی نثر نگاری اور صحافت کا ذکر ختم ہوتا ہے۔ آئندہ باب میں ان کی شاعری سے بحث کی جائے گی۔ چونکہ علامہ بنیادی طور پر شاعر ہی تھے اس لئے ان کی شاعری کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا جائے گا۔

شاعری

شاعری کی تعریف کرنا اور اس کے حدود متعین کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ یوں تو شعر اور شاعری سے ہر شخص واقف ہے اور ہر ایک کے ذہن میں شعر و شاعری کا لازمی طور پر کوئی نہ کوئی مفہوم ہوتا ہے لیکن اس مفہوم کی تفہیم بہت مشکل ہے۔۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک شاعری کی مکمل تعریف نہیں ہو سکی ہے۔ ویسے شاعری کی بے شمار تعریفیں ملتی ہیں۔ انگریزی۔۔۔ نقاد ڈاکٹر جانسن نے شاعری کی تعریف یوں کی ہے

"وہ ایسا موزوں کلام ہے اور ایسا فن ہے جس میں تخیل کی مدد سے سچائی کو مسرت سے ہمکنار کیا جاتا ہے"۔

ایک اور انگریز منفکریل کے نزدیک "شاعری میں الفاظ اور فکر کے ذریعہ جذبات کو پیکر عطا کیا جاتا ہے"۔ میکالے کے مطابق "شاعری ایک ایسا فن ہے جس میں الفاظ کے ذریعہ وہی کام لیا جاتا ہے جو ایک نقاش یا مصور رنگوں سے لیتا ہے"۔ کارلائل نے شاعری کو "مترنم خیال" کہا ہے۔ شیلے "تخیل کے اظہار" کو شاعری کہتا ہے۔ ورڈس ورتھ کے نزدیک "شاعری علم کی لطیف روح ہے"۔ میتھیو آرنالڈ شاعری کو ایک ایسا "مسرت انگیز اور مکمل ترین اظہار" کہتا ہے جہاں تک انسانی الفاظ کی رسائی ممکن ہے۔

شاعری کی ایسی بے شمار تعریفیں کی جاتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی تعریف مکمل نہیں ہے اصل میں شاعری میں انسانی

زندگی کے اہم ترین تجربات کا بہترین اظہار ہوتا ہے اور ان تجربات کی نوعیت اور ان کے اظہار کے اتنے اور ایسے بے شمار طریقے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا صرف شاعری ہی میں ممکن ہے لیکن شاعری کی کوئی بھی تعریف اتنی جامع اور بامعنی نہیں ہو سکتی کہ جسے حیطۂ اظہار ...... میں لیا جا سکے۔ لیکن اس کے باوجود ان تعریفوں سے مفر ممکن نہیں ہے اور نہ اس کی اہمیت سے بالکلیہ انکار ممکن ہے۔ کیوں کہ ہڈسن کے کہنے کے مطابق

"شعر کی تعریف کی ضرورت اس وجہ سے لاحق ہوتی ہے کہ عام اور امتیازی عناصر میں شعر کی خوبی کا معیار مقرر کرنے میں کوئی اصول ہماری رہبری کے لئے موجود نہیں رہتا۔"

جس طرح مغرب میں شاعری کی مختلف تعریفیں ملتی ہیں اسی طرح مشرق میں بھی ایسی تعریفوں کی بہتات ہے۔ مشرق میں عام طور پر شاعری کی جو تعریف کی جاتی ہے وہ شبلی کے الفاظ میں یہ ہے:

کلام موزوں ہو اور متکلم نے بہ ارادہ موزوں کیا ہو"

لیکن شاعری کی یہ تعریف نامکمل ہے کیوں کہ شعر میں معنی کی اہمیت زیادہ ہے۔ اگر کلام موزوں ہو لیکن بے معنی ہو تو ظاہر ہے کہ مہمل ہوگا اس لئے اس کی مکمل تعریف یہ ہو سکتی ہے:

"کلام موزوں ہو، بامعنی ہو اور بالارادہ کہا گیا ہو۔"

یہاں بالارادہ کی شرط بھی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اکثر شاعروں پر جب ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ بغیر ارادہ کے شعر کہنے لگتے ہیں اور پھر موزونیت بھی شاعری میں ایک طرح سے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں لکھا ہے

"نفیس شعر وزن کا محتاج نہیں۔ اس موقعہ پر جیسے انگریزی میں دو لفظ مستعمل ہیں ایک POETRY اور دوسرا VERSE۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی دو لفظ استعمال میں آتے ہیں۔ ایک شعر اور دوسرا نظم اور جس طرح ان کے یہاں وزن کی شرط POETRY کے لئے نہیں بلکہ VERSE کے لئے اسی طرح ہمارے ہاں بھی یہ شرط شعر میں نہیں بلکہ نظم میں معتبر ہونی چاہیئے"

اس طرح شاعری میں وزن کی اہمیت ثانوی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مشرقی شاعری میں اس کی اپنی ایک جگہ ہے۔ اصل میں بحر اور وزن شاعری میں تناسب پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح جذبہ اور خیال سانچہ میں ڈھلتے ہیں اور شعر کا وجود ہوتا ہے۔

شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں۔ شعور بقول شبلی نعمانی اصل میں احساس کو کہتے ہیں" یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو۔ اور یہی احساس جب موزوں الفاظ کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے تو وہ شاعری کہلاتا ہے۔ شاعری میں تخیل کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اسی کے بل بوتے پر شاعر اپنے کلام میں استعارات، تشبیہات علامات اور رمز پیدا کرتا ہے۔ شاعری کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ" یہ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب ہے"۔

ہر چند کے شعر کہنے کے چند مسلمہ اصول ہوتے ہیں لیکن ان اصولوں پر کاربند ہو کر ہر شخص شعر نہیں کہہ سکتا بلکہ یہ ایک قدرتی جذبہ ہوتا ہے اور خاص لوگوں کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ" شاعری کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے"۔

مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں انگریزی شاعری جان ملٹن کے حوالہ سے شعر کی تین خصوصیات بیان کی ہیں۔

(۱) سادگی (۲) اصلیت اور (۳) جوش

جہاں تک علامہ حیرت بدایونی کی شاعری کا تعلق ہے اس میں یہ تینوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

شاعری علامہ کو ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے دادا منصف عظمت علی بھی شاعر تھے۔ اور فیا تخلص کرتے تھے۔ والد محمد حسن بھی شاعر تھے اور اپنے نام کی مناسبت سے محسن تخلص کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی سلطان حسن بھی شاعر تھے۔ اور بر تخلص کرتے تھے۔ یہ تو ہوئی دادھیال کی بات لیکن ان کے ننہال میں بھی شروع سے علم و ادب کی فضاء پائی جاتی تھی۔ ان کے نانا بھی منصف تھے۔ عزیز الدین نام تھا اور عزیز تخلص کرتے تھے۔ علامہ کے ایک ماموں بھی شاعر تھے۔

"بقول ہادی القادری حیرت صاحب نے اوائل عمر ہی سے شاعری شروع کردی تھی۔ پہلے پہل دوستوں کی محفل میں کلام سنایا۔ پھر اساتذہ کو دکھایا۔ کلام موزوں تھا اور جوش سے بھرا ہوا تھا۔ اس لئے خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہوئی اور پھر انہوں نے نجی محفلوں میں بھی کلام سنانا شروع کیا۔ جب شعور اور کلام میں پختگی آگئی تو بر سر عام کلام سنانے لگے اور چند ہی دن میں بہت مقبول ہو گئے پھر تو بدایون کا کوئی مشاعرہ ایسا نہیں تھا۔ جہاں یہ کلام نہ سناتے ہوں۔ بعد میں ان کی شہرت بدایون کی فصیلوں سے بھی باہر نکل گئی اور یہ آس پاس کے مشاعروں میں بلائے جانے لگے"۔

مطالعہ بھی اچھا تھا۔ پھر طبیعت میں شعر کا فطری ذوق موجود تھا اس لئے تیزی سے شعر کہنے لگے اور زود نویسوں کے زمرہ میں شامل ہو گئے ان کے پاس علم کا وافر ذخیرہ تھا لیکن انہوں نے اسے کبھی اپنی شاعری میں استعمال نہیں کیا۔ دراصل جس قسم کی عاشقانہ غزلیں وہ لکھتے تھے ان میں علمیت اور حکمت کا گزر کم ہی ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ شاعری کو ایک خرافات سمجھتے تھے۔

دنیا میں لوگ زہر کو امرت کہا کریں
میں جھوٹی بات کیوں کہوں حق بات کے سوا

یہ شاعری بھی ایک فروغ دروغ ہے
کچھ بھی نہیں ہے اس میں خرافات کے سوا

ایک بار جیلانی بانو نے ان سے کہا تھا۔

"باوا آپ اپنا علم اور فلسفہ شاعری میں کیوں نہیں لاتے؟"

جس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا:

نہیں جی، شاعری تو محض گوٹی کے لئے ہے!

ہادی القادری صاحب نے ان کی علمیت اور شاعری کے بارے میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:

اصل میں ان کی شاعری ان کی علمیت کو لے ڈوبی۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بہت بڑے عالم ہوتے۔"

مجھے بھی علامہ سے باتیں کرتے ہوئے بارہا اس امر کا احساس ہوا کہ ان کے پاس علمی معلومات کا جو خزانہ ہے ان کی شاعری اس سے یکسر خالی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ غزل میں علامہ کا رنگ عشقیہ

تھا اور وہاں علمیت اور سنجیدگی کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔

علامہ کی شاعری کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) مذہبی شاعری (۲) قومی شاعری اور (۳) غزل گوئی

مذہبی شاعری

علامہ شروع سے مذہبی آدمی تھے۔ بچپن سے وہ نماز روزے اور تلاوت قرآن کے عادی تھے۔ آنحضرت صلعم، حضرت علی، امام حسین، خلفائے راشدین، حضرت غوث اعظم دستگیر اور دیگر تمام اولیاء اللہ سے وہ بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ آنحضرت کی شان میں ان کا نعتیہ کلام بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی شاعری کا آسانی سے ایک الگ مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔

علامہ کا سب سے پہلا مطبوعہ رسالہ دو سلاموں کا مجموعہ ہی ہے جو انتظامی پریس کانپور سے ۱۳۲۰ھ یعنی آج سے ۵۹ سال قبل شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے جو صوفی عزیز احمد صاحب مہتمم مدرسہ قراۃ القرآن کانپور کی فرمائش پر با اہتمام خواجہ عبدالواحد طبع ہوا تھا۔ یہ دونوں سلام انہوں نے عید میلاد کے موقع پر لکھے تھے اور کانپور میں منعقد عظیم الشان میلاد النبی کے جلسوں میں پڑھے تھے۔ پہلے سلام کا اس طرح آغاز ہوتا ہے

سلام حسرت بحضور سرکار رسالت بتقریب
عید ولادت صلی اللہ علیک وسلم

نورِ حقیقت شمعِ ہدایت صلی اللہ علیک وسلم
مہرِ نبوت بدرِ رسالت صلی اللہ علیک وسلم

دونوں جہاں سے اشرف و اعلیٰ اے میرے والی اے میرے مولیٰ
حق نے تجھے بخشی ہے ولایت صلی اللہ علیک وسلم

زمن کفر کو تو نے جلایا نور سے عالم کو چمکایا
اللہ اللہ تیری طلعت صلی اللہ علیک وسلم

جلوہ طور ہے تیری صورت نور ہی نور ہے تیری صورت
کانِ صباحت جانِ ملاحت صلی اللہ علیک وسلم

یہ سلسلہ جملہ ۲۸ اشعار پر مشتمل ہے اور ان اشعار پر ختم ہوتا ہے

تجھ کو خدائے پاک کی چاہت تجھ سے خدائے پاک کو الفت
تجھ پر خدائے پاک کی رحمت صلی اللہ علیک وسلم

حیرتؔ بھی ہے حاضرِ خدمت اس کا بھی دامن بھر دو حضرت
صدقہ حرمت عید ولادت صلی اللہ علیک وسلم

نوٹ

یہ وہ سلام ہے جو بارھویں ربیع الاول شریف ۰۷ ء کو محفل میلاد شریف میں قیام کے وقت پڑھا گیا تھا (حیرتؔ)

دوسرا سلام تیس اشعار پر مشتمل ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:

سلام گدا بحضورِ نوشاہ اسریٰ

یہ وہ سلام ہے جو ۲۶ رجب المرجب ۷۰ ء کو پریڈ گراؤنڈ کانپور کی عظیم الشان محفل معراج کے واسطے لکھا گیا اور پڑھا گیا:

یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک

یا حبیب سلام علیک — صلوات اللہ علیک
اے بڑے مزاج والے — دو جہاں کے راج والے
فتح حق کے تاج والے — شرم والے لاج والے

یا نبی سلام علیک

یہ سلام اس بند پر ختم ہوتا ہے

صدقہ اصحاب و عسرت یعنی — وہ بے ارباب ہو بت
فتح پائیں اہل ملت — بس یہی ہے عرض حسرت

یا نبی سلام علیک

اس زمانہ میں رسالہ "شمس العلوم" بدایون میں بھی ان کی ایک نعت شائع ہوئی تھی جو حسب ذیل ہے ؎

تمہیں معلوم ہے میرا افسانہ یا رسول اللہ
تو پھر اب کیا ضروری ہے سنانا یا رسول اللہ

تیری خاطر خدا نے آیت تطہیر قرآن سے
مطہر کر دیا تیرا گھرانا یا رسول اللہ

خدا معلوم مرتے وقت کیسے میرا دم نکلے
مجھے اس وقت تم مت بھول جانا یا رسول اللہ

گناہوں سے ملی فرصت نہ توبہ کا خیال آیا
تمہارا کام ہے اب کام آنا یا رسول اللہ

اٹھے گا ہر محب محبوب ہی کے ساتھ محشر میں
مجھے اپنے غلاموں میں اٹھانا یا رسول اللہ

علامہ کو آنحضرت صلعم کے علاوہ حضرت علی سے بھی بہت عقیدت

تھی اور انہوں نے اکثر حضرت علی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔
یہاں "نادِ علیؑ" کے عنوان سے ان کی ایک نظم پیش ہے ؎

نادِ علی کی جوت جگا جیون میں — یا مرتضیٰ یا ایلیا
علی کا نام لیا کر۔ امیر و غازی و صفدر۔ اسد اللہ و غضنفر۔ امام و ضیغم و حیدر

بیچ بھنور ہے موری نیا — کوئی نہیں ہے ناؤ کھویا
موری نیا پار لگا دے مانجھی — اے ناخدا آ کے بچا
علی کشتی کے شناور۔ علی ہیں ناصر و یاور۔ ولی اللہ و مظہر خدا کی فوج کے افسر

قلعہ خیبر تو نے اکھاڑا — مرحب کو عنتر کو بھی پچھاڑا
علی بازوئے پیمبر۔ علی ہیں فاتح خیبر۔ علی کی تیغ دو پیکر۔ علی ہیں قاتل عنتر

عقدہ کشائی کام ہے تیرا — شاہ ولایت نام ہے تیرا
شاہ نجف شاہ شہیدا سرورؑ — آل عبا مشکل کشا
علی ہیں میری زبان پر۔ علی سے آنکھیں منور۔ علی کا نقش ہے دل پر۔ علی ہیں جان کے اندر

کون سے لگا تیرے سوا میری بپتا — دادرسا فریاد رسا
علی تو ہے ساقی کوثر۔ علی تو شافع محشر علی کا سایہ ہے افسر۔ قیامت تک ہے سر پر علمدار کا ہے تو نظیر
علی حیرت کی مدد کر

علامہ نے حضرت علی کی شان میں بہت سی رباعیات بھی کہی ہیں۔ ایک

رباعی ملاحظہ ہو ؎

مولا کا ولی نبی کا نائب تو ہے
اُمت کا معین فی النوائب تو ہے
آئینۂ اعجاز ہے جانِ حیرت
واللہ کہ مظہر العجائب تو ہے

قومی شاعری

علامہ کے خیالات شروع سے قوم پرستانہ رہے ہیں۔ چنانچہ اوائل جوانی میں انہوں نے بے شمار نظمیں انگریزوں کے خلاف لکھیں اور خلافت کے جلسوں میں پڑھ کر بے پناہ داد حاصل کی۔ افسوس کہ ان کی یہ نظمیں اب کہیں دستیاب نہیں ہیں۔ میں نے ان کے کاغذات میں ان کی اس زمانے کی قوم پرست شاعری کے نمونے تلاش کئے لیکن وہ مجھے نہیں ملے۔ اصل میں علامہ اپنی چیزیں سنبھال کر رکھنے کے کبھی قائل نہ رہے۔ لکھا، پڑھا اور یوں ہی کہیں ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنا مجموعہ کلام "آئینہ" مرتب کرتے وقت بھی کافی دقت پیش آئی۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"شروع سے ہی میرا ارادہ دیوان مرتب کرکے شائع کرنے کا نہیں تھا۔ مگر میر عابد علی خاں صاحب مدیر "سیاست" نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں پرچے، چھوٹی موٹی کاپیاں گھر میں تلاش کرکے جمع کردوں اور ان سے مجموعہ مرتب کروں۔ جبراً قہراً یہ نہایت تکلیف دہ کام مجھے کرنا پڑا۔ سردست جو کچھ مل سکا وہ حاضر ہے"

آخری زمانے میں بھی علامہ کے خیالات قوم پرستانہ تھے البتہ درمیان میں تقسیم ملک کے وقت ۱۹۴۷ء میں ان کے خیالات کچھ بدل گئے تھے اور وہ دو قومی

نظریہ کے حامی بن گئے تھے۔ آزاد حیدرآباد کے ایک سالہ دور (۱۹۴۸ء) میں ان کے ان خیالات کو مزید ہوا ملی۔ اسی زمانے میں انہوں نے "لیڈر فرسٹ" نامی کتاب لکھی جو دو قومی نظریہ پر مبنی ہے۔۔ لیکن پولیس ایکشن کے بعد پھر ان کے خیالات بدل گئے اور وہ قوم پرستی کی طرف لوٹ گئے۔ جس کا عملی ثبوت بھی دیا۔ اس زمانے میں ہر حیدرآبادی مسلمان اور خصوصاً شمال سے آیا ہوا پناہ گزین پاکستان جانے کی فکر میں تھا۔ اور اکثر وہاں منتقل بھی ہو گئے لیکن علامہ نہ صرف خود پاکستان نہیں گئے بلکہ دوسروں کو بھی تلقین کی کہ وہ پاکستان نہ جائیں اور ہند ہی کو اپنا وطن سمجھیں۔ حیدرآباد میں آج بھی ایسے بہت سے خاندان ہیں جو علامہ کے اس مشورہ کے لئے بعد میں ان کے بہت شکر گذار ہوئے

علامہ بنیادی طور پر ایک شاعر آدمی تھے اس لئے بہت سے موقعوں پر انھوں نے اپنے ان قوم پرستانہ خیالات کو قلمبند بھی کیا ہے۔ جو اس زمانے کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے ہندوستان پر جارحانہ حملہ کیا تو انہوں نے "للکار" کے نام سے اپنے ملک و قوم کو للکارا ہ

جاگ اے ہندوستان اب جاگ اے ہندوستان
تاک میں تیری ہیں چینی ناگ اے ہندوستان
جاگ تجھ کو اپنی تاریخی قدامت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی روحانی روایت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی تہذیب و ثقافت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی عالمگیر شہرت کی قسم

جاگ تجھ کو اپنی خودداری و عزت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی غیرت کی حمیت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی فنکاری و صنعت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنے کھیتوں کی زراعت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنے مزدوروں کی محنت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنے دھن کی اپنی دولت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی اخلاقی جسارت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی بیباکی و جرات کی قسم
جاگ تجھ کو اپنے مردوں کی شجاعت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی خاتونوں کی عصمت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنے بچوں کی محبت کی قسم
جاگ تجھ کو چار سو ملین کی وحدت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنے نہرو کی سیاست کی قسم
جاگ تجھ کو اپنے گاندھی کی ہدایت کی قسم
جاگ تجھ کو اپنی آزادی کی قیمت کی قسم
دن میں جا کے بھیم وارجن کے ترانے چھیڑ دے
چھوڑ دے عیش و رباب کے اب فسانے چھوڑ دے
تجھ کو مسجد کی قسم دیر و کلیسا کی قسم
آذر و زرتشت کی اور ژند اوستا کی قسم
تجھ کو ہے نروان کی سوگند بدھا کی قسم

گردوارہ اور نانک شاہ بابا کی قسم
چار مینار اور کھار اختیار کی قسم
قلعہ دہلی کے ایوان بعلی کی قسم
تجھ کو اپنے خسرو اعظم اشوکا کی قسم
تجھ کو مندر کی قسم ہے تجھ کو پوجا کی قسم
تجھ کو گنگا کی قسم ہے تجھ کو جمنا کی قسم
رامچندر کی قسم ہے تجھ کو سیتا کی قسم
بندرابن کی قسم ہے تجھ کو متھرا کی قسم
تجھ کو رادھا کی قسم ہے تجھ کو کنھیا کی قسم
بدری و کیلاش کے اوج دوبالا کی قسم
تجھ کو اپنے ہر مقدس کوہ و دریا کی قسم
ارض کاشی کی قسم واس ہمالہ کی قسم
آج ہر قیمت ہمالہ کی حفاظت کرنی ہے
جان کی بازی لگا کر آن حاصل کرنی ہے

یہ طویل اور ولولہ انگیز نظم اس بند پر ختم ہوتی ہے ؎

جاگ اور خود جاگ کر سب کو جگا دے آج تو
اٹھ اور اٹھ کر اک نیا محشر اٹھا دے آج تو
وقت کہتا ہے کہ تن من دھن لٹا دے آج تو
جذبہ ایثار کے جوہر دکھا دے آج تو
آبرو پر جان کی بازی لگا دے آج تو
سرحدوں پر فتح کے پرچم اڑا دے آج تو

دھاک اپنی سرفروشی کی بٹھا دے آج تو
اپنے استقلال کا سکہ جما دے آج تو
غیرت پر جوش کی للکار ہے یہ آج تو
آج اس للکار پہ سر اپنا جھکا دے آج تو

علامہ جمال چین کے خلاف اپنی قوم کو للکارتے ہیں وہیں اس کا سبب باہم نفاق اور پھوٹ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک نظم "اعتراف" میں وہ کہتے ہیں ؎

اگر پھوٹ کی ہم میں لعنت نہ ہوتی
ہمارے دلوں میں شرارت نہ ہوتی
تعصب میں ڈوبی طبیعت نہ ہوتی
جھگڑنے کی لڑنے کی عادت نہ ہوتی
امارت کو غربت سے نفرت نہ ہوتی
رعیت میں باہم عداوت نہ ہوتی
یہ صوبوں میں باہم رقابت نہ ہوتی
زبان کی بناء پر خصومت نہ ہوتی
غلط فہمیوں کی یہ کثرت نہ ہوتی
وطن کی طرف سے یہ غفلت نہ ہوتی
تو پھر چین کی بھی یہ ہمت نہ ہوتی
کبھی ہم سے لڑنے کی جرأت نہ ہوتی
نزاعات میں ہم کو مصروف پا کر
ہوئے چین کے لشکری حملہ آور

پیشہ ور سیاست دانوں اور مفاد پرست لیڈروں سے علامہ کبھی مطمئن نہیں رہے۔ بارہا اپنی نجی زندگی میں وہ اس کا تذکرہ کرتے تھے۔ اور ان کی قومی شاعری میں بھی ہمیں اس موضوع پر ان کے خیالات ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک غزل نما نظم میں کہتے ہیں ؎

پھیلا تو رہے ہیں زہر مگر اکسیر کی باتیں کرتے ھیں
تخریب چمن کرنے والے تعمیر کی باتیں کرتے ھیں
لانے سے سحر آئے گی نہیں شب زاد سحر کیا لائیں گے
ظلمات میں لے جانے کے لئے تنویر کی باتیں کرتے ھیں
قسمت کی رسائی جب تک ہے تدبیر کا ہوتا ہے چرچا
تدبیر جب الٹی پڑتی ہے تقدیر کی باتیں کرتے ھیں
کیا کام ہے ماضی میں یہ پوچھنے والا کوئی نہیں
سب رائے دہندے رہبر کی تقریر کی باتیں کرتے ہیں

قومی تقریبات کے موقعہ پر بھی علامہ نے اپنے قلم کو جنبش دی ہے۔ چنانچہ جمہوریہ ہند کی سلور جوبلی پر انھوں نے یہ قطعہ کہا تھا۔

جمہوریہ کا جشن مبارک چمن ہند ۔۔۔ پچیس برس کی ہوئی اب تیری جوانی
اب پھول بھی آزاد ہیں کلیاں بھی ہیں آزاد ۔۔۔ دن کا کوئی راجہ ہے کوئی رات کی رانی

غزل گوئی

غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا۔ اصطلاح میں یہ ایک صنف شاعری ہے جس میں عشق و عاشقی اور

شوریدہ سری کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔ لیکن اب اس کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے اور اس میں ہر قسم کے مضامین اور موضوعات شامل کئے جارہے ہیں۔ غزل اردو میں فارسی کے توسط سے آئی۔ یہ اردو کی ایک قدیم اور مقبول صنف ہے۔ ایجاز اور اختصار غزل کی جان ہوتے ہیں۔ بہ ظاہر غزل کہنا جتنا آسان معلوم ہوتا ہے حقیقت میں یہ اتنا ہی مشکل کام ہے کیونکہ دو مصرعوں میں قافیہ اور ردیف کی پابندی کرتے ہوئے ایک مکمل خیال بیان کرنا اور اس میں تاثیر پیدا کرنا ایک کارِ دارد ہے اسی لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غزل کو "اردو شاعری کی آبرو" کہا ہے۔

اردو کی کلاسکی شاعری غزل سے بھری پڑی ہے۔ قدیم دور میں غزل کے ایک سے ایک نامور شاعر گذرے ہیں اس لئے اب اس کے شعری سرمائے میں اضافہ کرنا بہ ظاہر محال معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر دور میں یہ شعرا کی پسندیدہ صنف رہی ہے اور آج بھی ہے۔ علامہ حیرت بدایونی نے بھی زیادہ تر فکر سخن غزل ہی کے توسط سے کی ہے۔ چنانچہ ان کا آج تک کا واحد مطبوعہ اردو کلام 'آئینہ' تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی دو سو کے قریب غزلیں شامل ہیں۔

جس زمانے میں علامہ نے ہوش سنبھالا اور شاعری شروع کی وہ بیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا۔ حالی 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھ کر نوجوان شعراء کو پرانی روش چھوڑ دینے کا مشورہ دے چکے تھے اور اقبال اس پر عمل پیرا بھی تھے۔ محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی اور خود حالی اردو شاعری میں نئے تجربے کرچکے تھے۔ حسرت، اصغر، فانی

اور جگر غزل کی کلاسکی روایت کو توڑ کر اسے ایک نیا رنگ اور آہنگ دے رہے تھے۔ سرور، چکبست اور ظفر علی خاں سیاسی افکار و خیالات کو شاعری میں جگہ دے رہے تھے۔ یہ تھا وہ شعری ماحول جس میں بقول ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ "حیرتؔ بدایونی کے ذوقِ شعری کی نشو و نما ہوئی۔"

لیکن انہوں نے اپنے لئے غزل کا قدیم رنگ اختیار کیا اور عشقیہ اشعار کہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس زبان و بیان کا بے حد التزام ملتا ہے۔ ویسے ان کا تعلق کسی خاص اسکول سے نہیں رہا لیکن پھر بھی دلی اسکول کا رنگ ان کے پاس غالب ہے۔ اسی طرح انہوں نے کسی مخصوص شاعر کی پیروی نہیں کی لیکن داغؔ کی گہری چھاپ ان پر موجود ہے۔ علامہ نہ جوانی میں کسی کے شاگرد ہوئے اور نہ پیری میں کسی کو شاگرد بنایا۔ وہ اپنے خیالات و افکار میں کبھی کٹر بھی نہیں رہے۔ بقول شاذؔ تمکنت

"حیرتؔ صاحب قدیم پر مصر اور جدید سے بیزار نہیں تھے۔ وہ نئی شاعری کو حوصلہ افزا نظروں سے دیکھتے تھے اور شاید میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک نے انھیں متاثر کیا تھا۔"

ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ نے بھی اپنے مضمون "علامہ حیرتؔ بدایونی کی شاعری" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"ادبی ماحول نے ۱۹۴۳ء میں نئی کروٹ لی۔ حالی کی افادی شاعری اور اقبال کی ضربِ کلیمی اگلے وقتوں کی باتیں بن کر رہ گئیں۔ سنجیدہ اور سن رسیدہ شعرا بھی اس تحریک کی لپیٹ سے نہ بچ سکے۔ علامہ کی فنی لیاقت، وسیع المشربی اور شگفتہ مزاجی کے باعث حیدرآباد کے نوجوان ترقی پسندوں نے انھیں اپنا پیر مغاں بنالیا

اسی زمانے میں حیرت کو علامہ کہا جانے لگا۔ اس ماحول کا یہ اثر ہوا کہ ان کی شاعری میں حرکت و حیات اور طاقت و توانائی کا تصور آگیا۔ (روزنامہ "ملاپ" حیدرآباد مورخہ ۲۶ر مارچ ۱۹۷۶ء)

اپنے مجموعہ کلام "آئینہ" کے دیباچہ میں علامہ نے ایک جگہ لکھا ہے:
"مجھے ایک خود رو قسم کا شاعر سمجھ لیجئے۔ نہ استاد نہ شاگرد میں نے داغ، ذوق، امیر، غالب، میر تقی میر اور بہت سے شعراء کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور کوشش کی ہے کہ انھیں کے مخصوص رنگ زبان، تصورات غزل میں لائے جائیں۔ اس لئے میں کسی ایک اسلوب کا پابند نہیں ہوں۔"

لیکن اس کے باوجود ان کے پاس داغ کا رنگ بہت گہرا ملتا ہے اور نہ صرف چیدہ چیدہ بلکہ غزلوں کی غزلیں اسی رنگ میں ہیں۔ مثلاً یہ غزل ملاحظہ ہو:

دیکھئے پھر نہ ہمیں پائیے گا
بیٹھے جائیے گا جا ہیئے گا

آپ اور ترک جفا خوب کہی
یہ کسی اور سے فرمائیے گا

رات کا خواب الٰہی توبہ
آپ سنئے گا تو شرمائیے گا

اپنے جلووں کو اب آئینہ میں
آپ خود دیکھ کے شرمائیے گا

غیر کا ساتھ۔۔۔ خوشی ہے تو خیر
آپ تشریف مگر لائیے گا

ایک دن آئے گا وہ دن بھی ضرور
اپنی بیداد پہ پچھتائیے گا

بزم احباب میں آ کر حیرت
کچھ نہ کچھ آپ تو فرمائیے گا

علامہ نے ریاض خیر آبادی کی طرح زندگی بھر شراب کو منہ نہیں لگایا لیکن ریاض کی طرح یہاں خمریات کے باب میں بے شمار اشعار ہیں اور بعض غزلوں میں تو شروع سے آخر تک شراب ہی کا ذکر ہے۔ مثلاً یہ غزل پڑھیے ؎

ادا ادا نفس نفس نظر نظر شراب ہے
وہ بت ز فرق تا قدم تمام تر شراب ہے

تری متاعِ زندگی ہے کائنات سیم و زر
مری متاعِ زندگی پیالہ بھر شراب ہے

فقیر ہوں تواضعِ جنابِ شیخ کیا کروں
جو ما حضر قبول ہو تو ما حضر شراب ہے

مرے حبیبِ مہ جبیں یہ ساغرِ زر دیں
نہ دے اگر گلاب ہے پلا اگر شراب ہے

مرا مرض مری دوا... مری فنا مری بقا
ہر ایک سوال کا جواب مختصر شراب ہے

یہ ارمغان خلد ہے اسے نہ پھینک محتسب
ارے خدائے پاک کے غضب سے ڈر شراب ہے

تری نگاہِ ناز تک شراب کا گزر نہیں
مری نگاہِ ناز کی نظر گزر شراب ہے

تلاطمِ نگاہِ بادہ آخریں میں غرق ہوں
گلے گلے سرور ہے کمر کمر شراب ہے

تری غزل سے حیرتؔ آج رقص میں ہیں بام و در
تری غزل ترا کلام پر اثر شراب ہے

علامہ سر تا پا حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ ان کے پاس عشقیہ موضوع پر بڑے تیکھے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حریم ناز کی چلمن اٹھائی جاتی ہے
نگاہ شوق پہ بجلی گرائی جاتی ہے

قدم اٹھائیں تو کیا حشر ہو خدا جانے
نظر اٹھا کے قیامت اٹھائی جاتی ہے

تجھے جمال مجسم بنا رہا ہے شباب
بہار ہے کہ ترے رخ پہ چھائی جاتی ہے

کہاں تم اور کہاں یہ چاند سورج
تمہارے حسن کی بات اور ہی ہے

خدا معلوم کیا ہو عالم حسن...!
حجابوں میں جب اتنی روشنی ہے

دمِ آخر ہے دم بھر کو تو آجاؤ   کہ جان آنکھوں میں آکر رک گئی ہے
یہ جادو حسن کا اللہ یہ جوانی   تم آئے یا قیامت آگئی ہے

ادھر پیچیدہ ان کی زلف پر خم ہوتی جاتی ہے / ادھر مجھ سے مری تقدیر برہم ہوتی جاتی ہے
زمانہ چل رہا ہے ان کی آنکھوں کے اشاروں پر / مکمل خود بخود تاریخ عالم ہوتی جاتی ہے

علامہ کی شخصیت پر جہاں عشق و شباب کا گہرا اثر رہا ہے وہیں وہ شروع سے مذہبی بھی رہا ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں آپ کو اس موضوع پر بھی اشعار ملتے ہیں۔ ان کے کلام پر تصوف کی چھاپ زیادہ تو نہیں لیکن ان کا کلام اس سے یکسر خالی بھی نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر حفیظ قتیل :

"علامہ میخانۂ تصوف کے میخوار تھے یا نہیں اس کا تو پتہ نہیں مگر وہ اس کوچہ کے آداب و اسرار سے خوب واقف ہیں۔ تصوف سے انھیں گہرا ذوق و شغف معلوم ہوتا ہے۔ وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو گہرے مطالعہ اور طبعی مناسبت کے بغیر نہیں کہی جا سکتیں"۔

علامہ کے اشعار میں مذہب اور تصوف کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

تم بھلا کہاں رہو گے بقید تعینات   ہٹ جائیں لمحہ بھر کو اگر درمیاں سے ہم
جلوۂ یار سے مخمور ہوا جاتا ہوں   طور سے برق سر طور ہوا جاتا ہوں
مجھے کہ میں غم کون و مکاں سے تھا آزاد   طلسم خانۂ ہستی میں لا کے لوٹ لیا
ہم آئینہ ہیں انھیں کے جمال کے حیرت   کوئی کمال بھی اپنا نہیں یہاں اپنا

علامہ کی شخصیت میں سیاسی شعور شروع سے جاگزیں رہا ہے چنانچہ ان کی غزلوں میں بھی اس کا پرتو ملتا ہے۔ بقول شاذ تمکنت

"جہاں ان کا کلام عاشقانہ ہے وہیں دورِ رواں اور عصرِ حاضر کی کشمکش سے بے خبر نہیں ہے۔ یہ وصف میں نے جگر کے بعد علامہ حیرت بدایونی کے ہاں پایا ہے کہ وہ چڑھتے سورج کی ادا پہچانتے تھے"

علامہ کے ان اشعار میں سیاسی پس منظر اور عصری اشارے صاف ملتے ہیں:

لوٹ کر لے گئے گھر شیخ و برہمن میرا
کر لیا منقسم آپس میں نشیمن میرا

کون رہبر ہے میرا کون ہے رہزن میرا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسے کیا سمجھوں

بڑھ جائے گا خود قافلہ امن و امان اور
تم جنگ کے منصوبے بناتے ہی رہو گے

جمہوریت کا خون بہاتا ہے آج کل
جمہوریت کے نام سے جمہور کش گروہ

پھیلا تو رہے ہیں زہر مگر اکسیر کی باتیں کرتے ہیں
تخریب چمن کرنے والے تعمیر کی باتیں کرتے ہیں

اب فرقہ پرست بھی حیرت کو کر دیں نظر انداز اگر
مستقبل کے ارباب نظر لکھیں گے ہمارا افسانہ

علامہ کی شاعری کا ایک وصف اس کی رجائیت ہے ہر چند کہ انھوں نے غزل کے میدان اور عشق کے موضوع کو اپنایا لیکن اس کے باوجود ان کے یاس المیہ اشعار نہیں ملتے بلکہ ان کی شاعری تمام تر طرب و نشاط کی شاعری ہے جس میں شاعر پر کچھ زیادہ ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بقول شاذ تمکنت

حیرت صاحب، نشاط کے شاعر تھے۔ نشاطیہ شاعری یوں بھی کار مشکل ہے۔ کیوں کہ حزن و یاس میں تاثیر از خود پیدا ہوتی ہے لیکن نشاطیہ لب و لہجہ اس وقت تک دل پر اثر نہیں کرتا جب تک کہ جذبہ

طرب شاعر کے دل سے سوتے کی طرح پھوٹ نہ پڑے۔

علامہ کا سارا کلام ہی جوش و ولولہ سے پُر ہے۔ یہاں ایک غزل کے چند شعر مثلاً پیش ہیں ؎

عشق نے جب میرے جذبات کا رخ ٹٹولا — میں نے دنیا کی مہمات کا رخ موڑ دیا
ہیں کچھ ایسے بھی تہی بادہ کشوں میں ساقی — کہ پی کے لہرائے تو خطرات کا رخ موڑ دیا
یہ ہمیں اہلِ جنوں ہیں جو ذرا چونک اٹھے — اک ہی آن میں حالات کا رخ موڑ دیا
ہم فقیروں نے لگایا جو کبھی نعرۂ ہو! — پی کے لہرائے تو خطرات کا رخ موڑ دیا
ہم وہی پیکرِ خاکی ہیں کہ اکثر ہم نے — گردشِ ارض و سماوات کا رخ موڑ دیا

علامہ کے کلام میں زبان و بیان کا خاص التزام پایا جاتا ہے۔ انشاء اللہ خاں انشاء نے "دریائے لطافت" میں یہ اصول مقرر کیا تھا کہ جو لفظ اردو میں جس طرح آیا اور جس طرح اور جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے وہی صحیح ہے۔ اس سلسلہ میں عربی یا فارسی سے رجوع ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور وہاں اس کا تلفظ اور معنی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن علامہ ہر لفظ کی سند عربی یا فارسی سے ڈھونڈتے تھے اور اپنی تمام زندگی اور بول چال میں بھی زبان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اپنے مجموعہ کلام "آئینہ" کے دیباچہ میں انہوں نے اس امر پہ روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

• "رواج عام ہو جانے سے میں کسی غلط محاورے یا تلفظ کو صحیح یا جائز سمجھنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس ذہنیت کی تائید سے اردو کا ستیاناس ہو جائے گا۔ گناہ اور غلطی کتنی ہی عام خواہ یہ رواج پا جائے مگر گناہ اور غلطی غلطی ہی رہے گی۔ بزرگوں کو ایک

فقرہ یاد ہو گیا ہے۔ غلط العام فصیح اور غلط العوام فصیح۔ میں اس کو...... ایک دھوکہ سمجھتا ہوں۔ عام اور عوام میں کوئی فرق نہیں۔ غلطی عوام کی ہو یا خواص کی وہ غلطی ہی رہے گی اور غلطی ہی کہلائے گی۔"

انھوں نے شاعری میں زبان و بیان کے علاوہ فکر و فن اور عروض و بحر کا بھی خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی غزلوں کے آخر میں سن تصنیف لکھنا ضروری نہیں سمجھا مگر بحر کا نام لکھنا نہیں بھولے۔ اس سلسلہ میں ایک انٹرویو میں اردو کے نوجوان شاعر شاذ تمکنت نے کہا تھا:

"ان کے اشعار تمام تر عروض و فن کے معیار کو مقصد نظر بنا کر لکھے گئے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے جذبہ و خیال کا دامن نہیں چھوڑا یہی شاعری کا اصل مقصد ہے۔"

علامہ کے کلام میں زبان و بیان کے التزام اور فکر و فن کے اہتمام کے علاوہ شعور کی پختگی بھی پائی جاتی ہے۔ علامہ نے خاصی طویل عمر پائی تھی بچپن ہی سے ان کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ بڑے ہو کر بھی پیشہ تدریس سے وابستہ ہونے اور لکھنے پڑھنے کو تاحیات مشغلہ بنائے رکھنے کی وجہ سے ان کی شخصیت میں بڑی جہاں دیدگی پیدا ہو گئی تھی ڈاکٹر حفیظ قتیل نے بھی ان کے اس وصف کی جانب اشارہ کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

علامہ حیرت بدایونی کی شاعری اور شخصیت کا ایک نمایاں وصف ان کے شعور کی پختگی ہے۔ فنی شعور، سیاسی شعور، سماجی شعور، مذہبی شعور۔ غرض ان کے شعور کی ہر جہت میں فکر و تجربہ کی دلواہت

ملتی ہے جو فکر و نظر کی ممارست کے بغیر میسر نہیں آتی اس لیے ان کی ہر بات میں تہہ داری بھی ہے اور جدت ادا بھی۔ علامہ شعر پر گہری نظر رکھتے تھے اور وہ رموز شعر کے اچھے پارکھ تھے

۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے ادبی و شعری حلقوں میں حسب ذیل دو اشعار موضوع بحث بنے ہوئے تھے اور یہ کہا جا رہا تھا کہ یہ دونوں اشعار ایک ہی موضوع اور ایک ہی مضمون کا احاطہ کیئے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو مس کر کہے گئے ہیں حیدرآباد کے ایک شاعر اور تمنا اورنگ آبادی کے شاگرد جناب نذیر علی عدیل نے جب یہ شعر علامہ سے رجوع کئے تو انہوں نے ان کے بارے میں رائے دی تھی جس سے شعر پر ان کی نظر کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ کیوں مجھ گنہگار سے یہ سخت امتحاں
پروردگار یہ تو رسولوں کی بات ہے

۲۔ دینے والے آج دے اس وقت دے
صبر تو پیغمبروں کا کام ہے

پہلے شعر میں سخت امتحان کو مختص بہ رسالت کیا گیا ہے لیکن آیات قرآنی کی روشنی میں امتحان سخت ہو یا نسبتاً اس کا برزم ہونا پایا جاتا ہے (انبیاء شہداء، صالحین اور اولیاء سے بھی لیا گیا ہے) علیٰ ہذا القیاس دوسرے شعر میں عطا و نعمت کی تاخیر پر انتظار یا صبر کرنا جو کہا گیا ہے کہ مختص بہ رسالت و نبوت نہیں ہے۔ لیکن کوئی شاعر قرآن کی روشنی میں شعر نہیں کہتا۔ امتحانات میں استقامت کو رسول سے مختص کرنا اور نعمت

فیضی کے ملنے میں تاخیر کو صبر و شکیب پر محمول کرنا مبالغہ ہے اور شعر کی قوت و تاثیر کے لئے ہے۔ دونوں اشعار کے تصورات الگ الگ ہیں۔ پہلے شعر میں عز و دل بلا بہ استقامت کو مختص بہ رسالت کیا گیا ہے اور دوسرے شعر میں عطائے نعمت کی تاخیر پر صبر کو پیغمبروں کا کام کیا گیا ہے۔ دونوں اشعار باہم منفرد اور علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔

لیکن اس تمام علمیت اور شعر پر گہری نظر کے باوجود علامہ کے پاس بھی کمزور اشعار ملتے ہیں اور عشقیہ غزلوں کے بعض اشعار میں عامیانہ پن صاف نمایاں ہے۔ یہاں ان کے ایسے چند اشعار مثالاً پیش کئے جاتے ہیں:-

ہم آغوشی میں کس نے پہل کی تھی تم نے یا میں نے
انہیں سے پوچھ لو یہ بام و در یہ چاند تارے ہیں
اب ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے
نہ پوچھے کیسے کیسے مزے ہم نے بھی مارے ہیں
تصور میں آنا بھی ہے کوئی آنا
کبھی چھپ کے خلوت میں آؤ تو جانیں

علامہ حیرت بدایونی کی شاعری اور خصوصاً غزل گوئی پر جب ہم مجموعی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں تو یہ عقدہ کھلتا ہے کہ انہوں نے اپنے اظہار کے لئے قدیم طرز کو اپنایا تھا اور موضوع بھی پامال یعنی عشق کا چنا تھا۔ آج کے دور میں ایسی شاعری کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی لیکن شاذ تمکنت کے الفاظ میں یہ بات بھی

قابلِ غور ہے کہ، ان کی شاعری کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے آج کے اقدارِ شعری پر منحصر ہونا نامناسب ہے ۔

علامہ نے جس قسم کی شاعری کی ہے اس سے اساتذہ کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی کچھ دل کو نہیں لگتی کہ چونکہ ہماری شاعری میں بھی اساتذہ ہو گزرے ہیں۔ لہٰذا اب کوئی شاعری نہ کرے یا غزل نہ لکھے۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق فکرِ سخن تو کرے گا ہی اب یہ آنے والی نسلوں کا کام ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ کس شاعر کے پاس کتنے کام کے اشعار ملتے ہیں بجز ہر شاعر کا ذکر تاریخ ادب میں تو نہیں آسکتا لیکن محض تاریخ ادب میں ذکر نہ آنے کے خوف سے بھی کوئی شاعری ترک نہیں کر سکتا۔ یہ تو ایک اندرونی جذبہ ہوتا ہے جو شاعر سے شعر کہلواتا ہے اور ہر شاعر کے پاس کچھ نہ کچھ تو کام کے اشعار مل ہی جاتے ہیں ۔

علامہ حیرت بدایونی کے پاس بھی ہمیں بہت سے کام کے اشعار ملتے ہیں۔ عروض و بحر کے نمونے ملتے ہیں۔ زبان و بیان کے چٹخارے ملتے ہیں اور وہ رنگ ملتا ہے جو اساتذہ سخن خصوصاً داغ اسکول کے پاس تھا۔ علامہ کی حیثیت جدید اور قدیم کے درمیان ایک کڑی کی تھی ان کے جسدِ خاکی کے اٹھ جانے سے یہ کڑی ٹوٹی نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری کی شکل میں ہمارے پاس موجود رہے جسے ہم آئندہ ان کے اپنے الفاظ میں ۔

چار مینار کی طرح تاج محل کے طور پہ
دیکھیں گے ۔

ضمیمہ

علامہ حیرت بدایونی

کو شعراء کا منظوم خراج عقیدت

علامہ حیرت بدایونی

—— جوش ملیح آبادی

مکاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی ۔۔۔ زماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
نہایت نیک طینت ہیں مگر حد سے سوا کچھ ہو ۔۔۔ گماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
بڑے سنگین ہیں لیکن قمر چہروں کے جھرمٹ میں ۔۔۔ کتاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
سبک روی میں ہیں یکتا مگر میدان حشر میں ۔۔۔ گراں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
مجسم داد دیتے ہیں اور صبح کو یکسر ۔۔۔ اذاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
خضاب و خندہ و خوش لہجگی کے فیض سے ابتک ۔۔۔ جواں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
جو مسجد سے پکارا میکدے سے یہ صدا آئی ۔۔۔ یہاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

جھکے سجدے میں اور کعبے میں پہنچے لوگ چیخ اٹھے
کہاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

۵

نوٹ :۔ یہ نظم علامہ حیرت بدایونی کی زندگی میں لکھی گئی تھی

قطعہ تاریخ وفات علامہ حیرت بدایونی

بیکس الہ آبادی

نکھر آئی تھی جو ان سے - وہ محفل ہو گئی سونی
ہوئے علامہ حیرت - غریق رحمت ابدی

۱۹۷۵ء

○

مادہ ہائے تاریخ انتقال علامہ حیرت بدایونی

محمد عبدالکریم ماہر حیدرآبادی

یادگار زمانہ علامہ ۔۔۔ پیکر فضل اور دانش و ہوش
جس کا ہر شعر اک گل تازہ ۔۔۔ ہر غزل جس کی گلبدن گلپوش
جس کا آئینہ سخن بھی ہے ۔۔۔ جلوہ حسن یار کا ہم دوش
جس کے کردار سے جھلکتی تھی ۔۔۔ محبت اخلاص کی مئے پرجوش
اٹھ گیا وہ تو بزم ہے گم صم ۔۔۔ جوش اگلا سا اب رہا نہ خروش
خلد صالحین میں پائی ۔۔۔ رحمت کردگار کی آغوش
یاد ہر وقت آئے گا ماہر ۔۔۔ حیرت بذلہ سنج و نکتہ فروش

فکر تاریخ تھی تو حل نکلا
شمع بزم ادب ہوئی خاموش

۱۴۳۳ - ۳۸ - ۱۳۹۵ھ

○

یادِ حیرتؔ

(زاہد رضوی)

یادش بخیر عہدِ گذشتہ نظر میں ہے
میٹھا سا درد آج جو قلب و جگر میں ہے

ماضی کا کس قدر وہ زمانہ ہے یادگار
وہ اور زندگی کا ہے کس درجہ شاہکار

وہ محفلیں رہیں نہ وہ اب انجمن رہی
افسوس ہے کہ نہ وہ بزمِ سخن رہی

حیرتؔ کا تذکرہ ہے یہ حیرت کی بات ہے
کل زندگی کا دن تھا اجل کی یہ رات ہے

سونی پڑی ہے بزمِ سخن داں کہاں ہو تم
ہے غم سے سرد قلبِ محباں کہاں ہو تم

وہ صحبتیں رہیں نہ وہ شعر و سخن کی بات
باقی رہی نہ پہلی سی وہ رونقِ حیات

حیرت ہے خواب ہو گئی حیرتؔ کی زندگی
"آئینہ" ہے بقا کا مگر ان کی شاعری

ہر فرد جن کو کہتا تھا اہلِ کمال ہے
شعر و ادب میں ان کی سعی لازوال ہے

حیرتؔ کے ہے کلام میں اردوستان کی آن
تھے مدتوں جو شعر و ادب کے یہ پاسباں

پیشِ نظر تھا ان کے ہر اک دور کا رواج
تھے بذلہ سنج اور بہت منکسر مزاج

دستِ اجل کا ہو گیا ان پر جو ایک وار
ہیں محوِ خواب آج جو حیرتؔ تہِ مزار

جس وقت ختم ہو گیا سامانِ زندگی
پامال ہو کے رہ گیا ارمانِ زندگی

زاہد بس اک نظر میں زمانہ بدل گیا
حیرتؔ کی زندگی کا فسانہ بدل گیا

٥

نوحہ (بیادِ حیرت بدایونی)

——— وقار خلیل

سفید رنگ رہ گیا
دھل کے بھی سفید رنگ رہ گیا
اور جو تھا بہہ گیا
نہیں ہے وہ
یہ آئینے میں عکسِ لمس رہ گیا
شبیہہ کتنی صاف جیسے روئی ہو دھنی ہوئی
آئینہ بنی ہوئی

وہ پہلا آدمی نہ تھا
سخن سخن شعور لب
سفید رنگ کی جنوں جنوں خرد خرد
غزل غزل شباب تھا
چمن چمن گلاب تھا

٥

کتابیات

ان کتابوں کے نام جن سے اس کتاب کی تیاری میں مدد لی گئی

۱۔ آئینہ۔ اردو مجموعہ کلام، علامہ حیرت بدایونی

۲۔ لیڈرز فرسٹ۔ علامہ کی نثری تصنیف

۳۔ جنگل کانفرنس ۴۔ جیل خانہ ۵ پاگل خانہ (بچوں کیلئے لکھی گئیں)

۶۔ شہسوار ۷۔ خواجہ معین الدین ۸۔ خواجہ نظام الدین (یہ علامہ حیرت بدایونی کی کتابیں)

۹۔ دربار دُربار از صدق جائسی

۱۰۔ یادوں کی برات از جوش ملیح آبادی

۱۱۔ بدایون۔ قدیم اور جدید از نظامی بدایونی

۱۲۔ مقدمہ شعر و شاعری از خواجہ الطاف حسین حالی

۱۳۔ ہماری شاعری از سید مسعود حسن رضوی۔

۱۴۔ حیدر آباد کے شاعر مرتبہ ڈاکٹر حمید الدین شاہد

۱۵۔ فانی بدایونی از ڈاکٹر مغنی تبسم

۱۶۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد از ڈاکٹر حبیب ضیا قادریہ

۱۷۔ سرود رفتہ از سید اشفاق حسین (مرتبہ سیمیں اصغر)

۱۸۔ رسالہ "سب رس" (زور نمبر) مرتبہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد

شخصیات

(ان حضرات کے اسمائے گرامی جن سے اس کتاب کی تیاری کے دوران انٹرویو لئے گئے)

۱۔ جناب ہادی القادری (لکچرار عربی نظام کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)

۲۔ جناب حاجی بشیر احمد (علامہ حیرت بدایونی کے دوست)

۳۔ ڈاکٹر انور معظم (صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)

۴۔ محترمہ جیلانی بانو (ممتاز افسانہ نگار اور علامہ کی منجھلی صاجزادی)

۵۔ جناب اختر حسن (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی حیدرآباد)

۶۔ جناب غلام ربانی (اردو کے کہنہ مشق ادیب مولوی عبدالحق کے ساتھی اور علامہ کے دوست)

۷۔ شاذ تمکنت (لکچرار اردو انوار العلوم ایوننگ کالج حیدرآباد)

۸۔ محترمہ عائشہ بانو (علامہ حیرت بدایونی کی بڑی صاجزادی)

۹۔ احمد جلیس (پروگرام اگزیکیٹو اردو، آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)

۱۰۔ مولانا معز ملتانی (اردو کے شاعر اور علامہ کے دوست)

۱۱۔ بیخبر الہ آبادی (اردو کے کہنہ مشق شاعر اور علامہ کے دوست)

۱۲۔ جناب حسن الدین احمد (ممتاز ادیب، ناظم محکمہ بندوبست حیدرآباد)

۱۳۔ ڈاکٹر مغنی تبسم (ریڈر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

۱۴۔ جناب اشفاق حسین (ممتاز ادیب سابق ناظم آل انڈیا ریڈیو بمبئی)



رشید الدین

۴ دسمبر ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے۔ قاضی گھرانے
سے تعلق ہے۔ وطن ناگاپور ضلع اورنگ آباد
(دکن) ہے۔ بچپن سے پڑھنے لکھنے کا ذوق ہے۔ قلم اور ہوش
ایک ساتھ سنبھالا۔ مرہٹواڑہ یونیورسٹی کے پہلے بیاچ (۱۹
کے گریجویٹ ہیں۔ بعد میں (۱۹۷۶ء) عثمانیہ یونیورسٹی
کے ساتھ ایم۔اے کیا۔ پچھلے ۲۰ سال سے نظامت
آندھرا پردیش حیدرآباد میں اردو کے مترجم ہیں۔ ترجمے ک
لکھتے ہیں اور ترجمہ نگاری کا بھی شغف رکھتے ہیں م
رسائل میں چھپ چکے... اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر
نثر کے عبدالحق اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور
زبان... لکھتے ہیں۔ ادب، صحافت اور تدریسی تیئں
دلچسپی رکھتے ہیں۔